1857 کا جہاد

تالیف و تحقیق

پیام شاہجہان پوری

1857 کا جہاد

تالیف

پیام شاہجہانپوری

ادارہ تاریخ و تحقیق این۔23، عوامی فلیٹس، ریواز گارڈن لاہور (54000)

نام کتاب	:	''۱۸۵۷ کا جہاد''؟
مصنف	:	پیام شاہجہانپوری
ناشر	:	رضی الدین خاں
طابع	:	چوہدری طاہر حمید پریس
		6-قطب روڈ عقب داتا دربار ہسپتال' لاہور
مقام اشاعت	:	این/23 عوامی فلیٹس' ریواز گارڈن لاہور
کمپوزنگ	:	تصور کمپوزنگ سنٹر' 108- لٹن روڈ لاہور
باردوم	:	دسمبر 2002ء
		(قیمتی اضافوں کے ساتھ)
ٹیلی فون نمبر	:	7322313
تعداد	:	500

قیمت =/150 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

آغازِ کلام

یوں تو دنیا میں رونما ہونے والا کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں متضاد خبریں تاریخ کے صفحات پر درج نہ ہوں لیکن انگریزوں کے خلاف 1857ء میں جو بغاوت رونما ہوئی تھی اس کے بارے میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان بوجھ کر غلط بیانیوں اور مبالغہ آرائیوں سے کام لیا گیا۔ گویا جھوٹ بولنے اور روایتیں گھڑنے کا ایک مقابلہ تھا جس میں ایک "فنکار" دوسرے "فنکار" پر سبقت لے جانے میں سرگرم عمل تھا۔ اس طرح واقعات کو اپنی خواہشات کے سانچے میں ڈھالنے کی ناپسندیدہ کوشش کی گئی۔ نتیجہ یہ کہ تاریخ کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا اور سچ اور جھوٹ میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ اس بغاوت کو ملک گیر اور ایک منظم عوامی تحریک کی حیثیت سے روشناس کروایا گیا' اسے جنگ آزادی بنا کر پیش کیا گیا اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگوں نے اسے "اسلامی جہاد" بنا ڈالا۔ کاش ایسا ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

اس موضوع پر دستیاب لٹریچر کا مطالعہ کرنے کے بعد ہر منصف مزاج شخص اسی نتیجے پر پہنچے گا کہ یہ بغاوت دیسی سپاہیوں اور کچھ ہندوستانی امراء کے ذاتی مفادات کی جنگ تھی۔ اس سے زیادہ اس شورش کی اور کوئی حیثیت نہیں یعنی بلند قومی و ملی مقاصد (معدودے چند کے سوائے) کسی کے پیش نظر نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے باشعور مسلمان اکابر اور ہر فرقے کے ممتاز علماء (باستثنائے چند) اس بغاوت سے قطعی طور پر لاتعلق رہے' نہ انہوں نے اسے جہاد قرار دیا اور نہ اپنے زیر اثر افراد کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دی بلکہ اس میں شمولیت کے خلاف فتوے دیئے اور اسے مسلمانوں کے لئے تباہ کن قرار دیا۔

زیر نظر کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ 1857ء میں رونما ہونے والے واقعات کو کسی مبالغے اور رنگ آمیزی کے بغیر ان کے اصل پس منظر کے ساتھ پیش کیا جائے۔ کتاب لکھتے وقت بہت سختی سے اس امر کا التزام کیا گیا ہے کہ کوئی بات حوالے کے بغیر نہ لکھی جائے اور حوالے مستند ہوں۔ آئندہ صفحات میں آپ اس موضوع سے متعلق وہ تفاصیل پڑھیں گے جن سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ 1857ء کی شورش مسلمانوں کے لئے بربادی کا پیغام تھی۔ اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو اس ملک میں مسلمانوں کے لئے عزت و آبرو کے ساتھ زندگی گزارنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا۔ نہ صرف مسلمانوں کے لئے آبرومندانہ زندگی گزارنا ممکن نہ رہتا بلکہ سارا ملک تباہ کن انارکی کا شکار ہو جاتا اور پھر خدا ہی جانتا ہے کہ اس ملک کا کیا حشر ہوتا۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سرسید احمد خاں اور ان کے بعض معاصرین بہت دور اندیش اور زیرک لوگ تھے جن میں بعض جید علماء اور اپنے فرقوں کے ممتاز رہنما بھی شامل تھے جو اس بغاوت کو شرعاً" ناجائز اور خلاف اسلام قرار دے رہے تھے۔ انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اس وقت پورے ملک میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں جو اس بغاوت کی قیادت کا اہل ہو' نہ باغیوں کے پاس ایسے وسائل ہیں جنہیں کام میں لا کر وہ ایک Established (قائم شدہ) اور مضبوط حکومت کا مقابلہ کر کے اس پر فتح حاصل کر سکیں۔ اس لئے سرسید اور ان کے بعض معاصرین نے اہل وطن خصوصاً" مسلمانوں کو اس شورش میں حصہ لینے سے روکا تاکہ وہ ایک طرف ہندو اور دوسری طرف فاتح انگریز کے مظالم کے درمیان پس کر تباہ و برباد نہ ہو جائیں۔ سرسید احمد خاں کا یہ وہ احسان ہے جسے آنے والی نسلیں بھی نہ بھلا سکیں گی۔

کتاب کے آخر میں ایک باب اقبال کے تصور پاکستان کے بارے میں شامل کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ غیر ضروری یا لاتعلق معلوم ہو گا مگر در حقیقت ایسا نہیں۔ ہفت روزہ "تقاضے" (لاہور) جس میں سرسید احمد خاں اور 1857ء کی شورش پر بحث و گفتگو کا آغاز ہوا تھا اسی میں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا تھا اور بعض مضمون نگار حضرات نے سرسید سے موازنہ کرنے کے بعد اقبال کو تصور پاکستان کا خالق ثابت کیا تھا۔ چونکہ یہ بہت بڑا

جھوٹ تھا جو آج تک مسلسل بولا جا رہا ہے اور نادانستہ طور پر تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس لئے لازم آیا کہ اس موضوع کا بھی حق ادا کر دیا جائے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں اپنی تاریخ سے صحیح طور پر آگاہ ہو سکیں اور حامد کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھنے کے جرم کا ارتکاب کرنے سے محفوظ رہیں۔

مجھے اندازہ ہے کہ یہ کتاب لکھ کر میں نے گھاٹے کا سودا کیا ہے اور میری یہ کوشش بعض حلقوں میں پسند نہیں کی جائے گی' یقیناً بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں گی کیونکہ یہ کتاب پڑھ کر ان کے غلط تصورات کے بت ٹوٹ جائیں گے مگر مجھے اس کی قطعاً" پروا نہیں۔ پروا صرف اس کی ہے کہ میرے قلم سے دانستہ طور پر کوئی غلط نقش صفحہ قرطاس پر ثبت نہ ہو جائے کہ قلم اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس نے قرآن شریف میں قلم کی قسم کھائی ہے۔

پیام شاہجہانپوری

(لاہور 27 اگست 2002ء)

❀❀❀

فہرست عنوانات

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ

تاریخی پس منظر

(1) مغل شہزادوں کی جنگ اقتدار 11
(2) مرہٹوں کو دہلی کا راستہ دکھانے والا 17
(3) نادر شاہ کو دعوت 18
(4) محمد شاہ اور سید برادران 22
(5) محمد شاہ اور نظام الملک 23
(6) نظام الملک کی شکست 24
(7) بنگال کا المیہ 25
(8) احمد شاہ ابدالی کی تباہ کاریاں 27
(9) صفدر جنگ اور غازی الدین کی کشمکش 31

سکھ سرداروں کی مسلم دشمنی

(10) بابا نانک سکھ مذہب کے بانی نہیں تھے 35
(11) گوبند سنگھ کی اسلام دشمنی 36
(12) لاہور کے بعض مسلمانوں کی غداری 40
(13) بندہ سنگھ کے مظالم 42
(14) بندہ سنگھ کے بعد سکھ سرداروں کی درندگی 43
(15) مسلمان شریف زادیوں کا حشر 43
(16) رنجیت سنگھ کی مسلم دشمنی 44
(17) مسجد وزیر خاں کی بے حرمتی 46
(18) موجودہ سکھ ماضی کے واقعات کے ذمہ دار نہیں 49

فرنگی تسلط کے اسباب

(19) بادشاہ ہندوستان کی پہلی بے تدبیری 53
(20) انگریزوں کی سیاست ہند میں پہلی مداخلت 54
(21) بنگال میں انگریزی حکومت کی بنیاد 56
(22) شجاع الدولہ اور شاہ عالم کی بے تدبیری 59
(23) روہیلہ افغانوں کی خود غرضی 61
(24) سلطان ٹیپو کی شہادت 61

1857ء کی بغاوت

(25) انقلاب کی کامیابی کی پانچ شرائط 65

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(26)	بہادر شاہ ظفر کی شخصیت	66
(27)	بادشاہ ظفر کی ایک تقریر	68
(28)	بہادر شاہ کی نظر میں باغیوں کا مقام	70
(29)	بہادر شاہ ظفر کا عدالتی بیان	72
(30)	بہادر شاہ کی بے بسی	75
(31)	بہادر شاہ کی دماغی کیفیت	77
(32)	اگر بغاوت کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا؟	78
(33)	علامہ فضل حق ؒ کا تبصرہ	79
(34)	گئو کشی کی سزا پھانسی؟	80
(35)	اعلان جہاد اور انجام	81
(36)	بغاوت میں شامل افراد کا نصب العین؟	82
(37)	باہمی روابط اور نظم وضبط کا فقدان	85
(38)	بغاوت کا دائرہ؟	87
(39)	پنجاب اور سندھ میں بغاوت کی حقیقت؟	88
(40)	ہندوستانیوں پر آفت	91
(41)	ہندوستانی فوج کا کردار	92
(42)	کیا باقی ہندوستان کے لوگ غدار تھے؟	93

علمائے دیوبند کا جہاد؟

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(43)	تھانہ بھون کا جہاد؟	97
(44)	بزرگانِ دیوبند کی باغیوں سے جنگ	99
(45)	انگریزی حکومت اور علمائے دیوبند	102
(46)	علمائے دین کا انگریزوں سے تعاون	105
(47)	فتویٰ جہاد اور علمائے دین	106

شیعہ علما کا جہاد؟

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(48)	شیعہ علما کی بصیرت	112
(49)	علامہ علی الحائری کا فتویٰ	113

علمائے اہل حدیث کا جہاد؟

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(50)	مولانا سید نذیر حسین محدث کا فتویٰ	116
(51)	شرائط جہاد	117
(52)	سرکار انگریزی سے جہاد جائز نہیں	118
(53)	ملکہ وکٹوریہ کا جشن جوبلی اور اہل حدیث	120

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(54)	جماعت اہل حدیث کا ملکہ وکٹوریہ کو ایڈریس	122
(55)	گورنر پنجاب کی خدمت میں اہل حدیث کا ایڈریس	124
(56)	مولانا محمد حسین بٹالوی اور جہاد	125
(57)	مولانا محمد حسین بٹالوی پر انگریزوں کی مہربانی	128
(58)	مولانا محبوب علیؒ کی بے نفسی	130

بریلوی علماء کا جہاد؟

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(59)	علامہ فضل حق ؒ اور 1857ء کی بغاوت	134
(60)	خانقاہ نشیں اور 1857ء کی بغاوت	138
(61)	پیر ولایت شاہ کی حمایت سرکار	140
(62)	مولانا احمد رضا خاں کا نظریہ جہاد	141
(63)	ہندی مسلمانوں پر جہاد فرض نہیں	141
(64)	پیرانِ عظام کا گورنر اڈ دائرہ کو سپاسنامہ	142
(65)	غازی امان اللہ خاں کی مذمت	146
(66)	مولانا مودودی کا نظریۂ جہاد	148
(67)	مولانا اشرف علی تھانوی کا نظریۂ جہاد	149
(68)	بغاوت کے حامی علماء	152

سید احمد شہیدؒ کا جہاد

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(69)	سید صاحبؒ کا نظریہ جہاد	155
(70)	ولیم ولسن ہنٹر کی رائے	157
(71)	اولف کیرو کا تبصرہ	160
(72)	مولوی جعفر تھانیسری کی رائے	161
(73)	مولانا مسعود عالم ندوی کی رائے	162
(74)	مولانا جعفر کی انگریز دشمنی	164
(75)	مولانا غلام رسول مہر کا تائیدی حوالہ	167
(76)	جہاد بادراز مویاں	169
(77)	نواب صدیق حسن خاں کی رائے	171
(78)	مولانا مناظر احسن گیلانی کا نظریہ	174

سر سید کی قومی غیرت

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ
(79)	اسباب بغاوت کی جرات مندانہ نشاندہی	177
(80)	اہل ہند کا بے خوف وکیل	181
(81)	سر سید کے خلاف انگریز رکن پارلیمنٹ کا غیظ وغضب	183

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ

جہاد کی حقیقت؟

(82) حضور اقدس کا اسوۂ حسنہ 186

(83) صحابہ کا جہاد پر اصرار 187

(84) قرآن کریم کی شہادت 188

(85) جہاد کب فرض ہوتا ہے؟ 189

(86) سکھوں کے خلاف جہاد کیوں نہیں ہوا؟ 191

سر محمد اقبال کا جہاد

(87) تاجدار برطانیہ کا نوحہ 197

(88) ملکہ وکٹوریہ "ظل اللہ" تھیں 198

(89) جوبلی فنڈ میں اقبال کا عطیہ 202

(90) اقبال آخر وقت تک انگریز کے وفادار رہے 203

(91) اقبال سنت پیغمبری پر عامل تھے 205

اقبال اور تصور پاکستان

(92) تصور پاکستان کا خالق اول مولانا شرر 210

(93) چوہدری رحمت علی کا نظریہ 211

(94) خیری برادران کا نظریہ 212

(95) نادر علی وکیل کی تجویز 212

(96) سردار گل محمد خاں کی تجویز 213

(97) مولانا محمد علی جوہر کی پیش گوئی 213

(98) لالہ لاجپت رائے کی تجویز 214

(99) سر اقبال کی تجویز 215

(100) تقسیم پنجاب و بنگال کا نقیب ــــ سر محمد اقبال 216

(101) خلاصۂ بحث 217

تاریخی پس منظر

دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کے غیرت مند باشندے یہ چاہتے ہوں کہ ان کا وطن کسی غیر قوم کا غلام ہو جائے۔ خود برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے ہر دور میں اپنی آزادی کا علم سربلند رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کوشش میں اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں، اپنے خاندانوں کو کٹوا دیا۔ سلطان ٹیپو، نواب سراج الدولہ اور روہیلکھنڈ کا غیرت دار افغان حکمراں حافظ رحمت خاںؒ ہمارے ایسے ہی سرفروش اور جاں باز اکابر میں سے تھے۔ مگر ان کی عظیم قربانیوں کے باوجود مسلمان اپنی آزادی کھو بیٹھے اور وطن عزیز انگریزوں کے زیر نگیں آ گیا۔

انگریز ہندوستان میں کیوں اور کیسے داخل ہوا؟ تاجروں کا ایک گروہ سمندر پار سے آ کر وسیع و عریض سلطنت قائم کرنے میں کس طرح کامیاب ہو گیا؟ بظاہر وہ مضبوط اور برصغیر کی تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت جسے اورنگ زیب عالم گیر نے بڑی جاں فشانی سے قائم کیا تھا، ریت کی دیوار کی طرح زمین پر کیونکر آ رہی؟ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب معلوم کئے بغیر تاریخ کا کوئی طالب علم ہندوستان میں انگریزوں کی سلطنت کے قیام اور 1857ء کی بغاوت کے حقیقی پس منظر سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یہ داستان عبرتناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔

مغل شہزادوں کی جنگ اقتدار

اورنگ زیب عالم گیر 1707ء میں فوت ہو گیا۔ اس کے انتقال کے وقت اس کا فرزند شہزادہ معظم پنجاب اور کابل کا گورنر تھا اور کابل ہی میں مقیم تھا۔ دوسرا بیٹا شہزادہ اعظم دکن میں اورنگ زیب کی نیابت کر رہا تھا۔ تیسرا بیٹا شہزادہ کام بخش بھی دکن میں

تھا۔ باپ کے انتقال کی خبر ملتے ہی شہزادہ معظم کابل سے روانہ ہوا اور گجرات (پنجاب) پہنچ کر شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے اپنی تخت نشینی کا اعلان کر دیا۔ اورنگ زیب کے دوسرے بیٹے شہزادہ اعظم نے دکن میں اپنی بادشاہت کا نقارہ بجوایا۔ اس کے بعد وہ اپنے بھائی معظم سے نبرد آزمائی کرنے کی غرض سے شمالی ہند کی طرف روانہ ہو گیا۔ آگرہ کے قریب دونوں بھائیوں کا مقابلہ ہوا۔ اس سخت اور برادر کش جنگ میں شہزادہ معظم کو فتح ہوئی اور شہزادہ اعظم خاک و خون میں تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اس کے بعد شہزادہ معظم اپنے دوسرے حریف شہزادہ کام بخش کی طرف متوجہ ہوا جو دکن میں اس کے اقتدار کو للکار رہا تھا۔ آخر کار حیدر آباد کے قریب دونوں بھائیوں میں جنگ ہوئی جس میں شہزادہ کام بخش کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اس طرح اپنے دو بھائیوں اور ہزاروں انسانی لاشوں پر شہزادہ معظم نے اپنے اقتدار کی عمارت تعمیر کی اور شاہ عالم بہادر شاہ کے لقب سے بے خوف و خطر سارے ہندوستان پر حکومت کرنے لگا۔ بہادر شاہ کو بمشکل پانچ سال حکومت کرنا نصیب ہوا۔ 1712ء میں اس کا لاہور میں انتقال ہو گیا۔

بہادر شاہ کے انتقال کے فوراً بعد کہ ابھی اس کی لاش شاہی خیمے میں پڑی ہوئی تھی حصول اقتدار کا دوسرا خونیں ڈرامہ شروع ہوا۔ اس کے چار بیٹوں میں دریائے راوی کے کنارے جنگ ہوئی جس میں جہاں دار شاہ فتح یاب ہوا اور اس کا بھائی شہزادہ عظیم الشان مع اپنے ہاتھی کے دریائے راوی میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد دوسرے دو بھائیوں جہاں دار شاہ اور جہان شاہ کے درمیان تخت نشینی کا دوسرا معرکہ ہوا۔ اس برادر کش جنگ میں جہان شاہ کو شکست ہوئی اور اپنے فرزند فرخندہ اختر کے ہمراہ میدان جنگ میں کام آیا۔ حصول اقتدار کا تیسرا معرکہ جہان دار شاہ اور اس کے آخری بھائی رفیع الشان کے درمیان ہوا۔ اس معرکے میں رفیع الشان ہلاک ہوا۔ اپنے سارے بھائیوں اور بھتیجے کو ٹھکانے لگا کر جہاں دار شاہ شاہی کروفر سے دہلی روانہ ہوا مگر اس کی حکومت کو استقلال نصیب نہ ہو سکا۔ اس کا بھتیجا اور مقتول شہزادہ عظیم الشان کا بیٹا فرخ سیر اپنے دو طاقتور جرنیلوں سید عبداللہ اور سید حسین علی کو ہمراہ لے کر اپنے

باپ کا انتقام لینے بہار سے دہلی روانہ ہو گیا۔ کئی خوں ریز لڑائیوں کے بعد جہاندار شاہ کو شکست ہوئی اور 1713ء میں فرخ سیر ہندوستان کا بادشاہ ہو گیا۔ اس جنگ میں جہاندار شاہ قتل ہوا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ شہزادہ فرخ سیر کا مقابلہ کرنے کی غرض سے لشکر لے کر نکلا تو طوائفوں اور سازندوں کا ایک لشکر بھی ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لال کور نامی طوائف جہاندار شاہ کی منظور نظر تھی اور تخت حکومت حاصل کرنے کے بعد جہاندار شاہ شب و روز اس کے ساتھ مصروف اختلاط رہتا تھا۔ ایک روایت کے مطابق شاہ موصوف شاہی رتھ میں بیٹھ کر اس کے ساتھ سیر کو نکلا کرتے تھے۔

جب فرخ سیر سخت خوں ریزی کے بعد تخت نشیں ہوا تو بظاہر یوں محسوس ہونے لگا کہ تیموری سلطنت کا آفتاب گہن سے نکل آیا ہے مگر یہ آخری سنبھالا تھا۔ جلد ہی فرخ سیر اور اس کے امرائے دربار میں چپقلش شروع ہو گئی۔ سید عبداللہ اور سید حسین علی جو اس دور کے بڑے طاقتور سردار تھے فرخ سیر کو بے دست و پا کر دینا چاہتے تھے۔ فرخ سیر ان کے ہاتھ میں کھلونا بننے کے لئے تیار نہ تھا۔ مگر اس میں وہ مردانگی، تدبر اور حوصلہ نہ تھا جو ایسی مہمات سر کرنے کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرخ سیر، سید حسین علی کے ہاتھوں اسیر ہوا اور بڑی کسمپرسی کے عالم میں 1718ء میں ہلاک کر دیا گیا۔

ایک ہم عصر مورخ لکھتا ہے کہ سادات (سید عبداللہ و سید حسین علی) نے فرخ سیر کو ایام اسیری میں پہلے تو زہر دے کر مارنے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی تب گلے میں رسی ڈال کر بڑی تکلیف سے اس کی جان نکالی۔ یہ روایت بھی اسی مورخ کی ہے کہ فرخ سیر نے (جس کے ہاتھ کھلے ہوئے تھے) رسی کو ہاتھوں سے پکڑ لیا۔ سادات کے سپاہیوں نے مکے مار مار کر رسی اس کے ہاتھ سے چھڑائی۔ آخر تڑپ تڑپ کر فرخ سیر نے جان دی۔ (1)

فرخ سیر کی معزولی کے بعد سید بھائی (سید عبداللہ و سید حسین علی) جو تاریخ میں بادشاہ گر کے نام سے مشہور ہوئے بہادر شاہ اول (ابن اورنگزیب) کے پوتے رفیع الدرجات کو لال قلعے کے زنان خانے سے نکال لائے اور اس کی تخت نشینی کا اعلان کر

دیا۔ رفیع الدرجات دق (ٹی بی) کا مریض تھا۔ تین ماہ سے زیادہ حکومت نہ کر سکا اور قید حکومت کے ساتھ ہی قید زندگی سے بھی نجات پا گیا۔ رفیع الدرجات کے انتقال کے بعد اس کے دوسرے بھائی رفیع القدر کی باری تھی۔ سید بھائیوں نے اسے حرم سرا سے بلوایا اور تخت سلطنت پر بٹھا کر شاہجہاں ثانی کا خطاب دیا۔ رفیع القدر افیون کا شائق اور سل کا مریض تھا چند ماہ کے بعد اس کا بھی انتقال ہو گیا۔ اب سید بھائیوں کی نگاہ انتخاب شہزادہ روشن اختر پر پڑی۔ یہ اورنگ زیب کا پوتا اور شہزادہ جہان شاہ کا بیٹا تھا۔ 1719ء میں شہزادہ روشن اختر، ناصرالدین محمد شاہ کے لقب سے ہندوستان کے تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ اس طرح تخت طاؤس نے ایک سال میں چار بادشاہوں کا بوجھ اٹھایا۔ کہتے ہیں کہ جب سید بھائیوں کے قاصد شہزادہ روشن اختر کو بادشاہ بنانے کی غرض سے سلیم گڑھ کے قلعے میں داخل ہوئے تو "شہزادہ کی ماں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور کہنے لگی کہ مجھ بیوہ کے حال پر رحم کرو۔ میرا ایک ہی بیٹا ہے خدا کے لئے اسے بادشاہ نہ بناؤ۔ اس کی جوانی پر ترس کھاؤ"۔(2)

محمد شاہ نے ابتدا میں ہوش گوش سے کام لیا اور اپنے پیش رو بادشاہوں کے انجام سے عبرت حاصل کر کے خود کو سید بھائیوں کی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ پہلے سید حسین علی اور آخر میں سید عبداللہ کو ٹھکانے لگا دیا گیا۔ اس طرح محمد شاہ بے خوف و خطر ہندوستان پر حکومت کرنے لگا لیکن جواں سال اور خوبصورت شہزادہ جلد ہی عیش و عشرت میں گرفتار ہو گیا۔ محمد شاہ شاہی محل کے زنان خانے میں رہتا تھا۔ اس کا خواجہ سرا جاوید اور رضائی بہن رحیمن امور سلطنت انجام دیتے تھے۔ بادشاہ کی مہر بھی بی رحیمن کے قبضے میں رہتی تھی۔ (3) آخر میں اس مہر کی بھی ضرورت نہ رہی تھی۔ بی رحیمن کے دستخط سے شاہی فرمان جاری ہوتے تھے۔ اس غریب کو قلعے کے باہر کے معاملات و حالات کی مطلق خبر نہ تھی۔ محمد شاہ کو عورتوں کے جھرمٹ میں رہنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

1748ء میں ناصرالدین محمد شاہ کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا احمد شاہ مسند نشین حکومت ہوا۔ احمد شاہ بھی اپنے باپ محمد شاہ کے نقش قدم پر چلا بلکہ اپنے باپ سے بھی

دس ہاتھ آگے نکل گیا۔ کئی کئی مہینے گزر جاتے کہ دربار میں آکر اپنی صورت تک نہ دکھاتا۔ خوبصورت عورتوں کا عاشق تھا اور سارا وقت انہی کے جھرمٹ میں گزار دیتا۔ اس کی ماں اودھم بائی اور ایک خواجہ سرا امور مملکت پر حاوی تھے۔ بادشاہ کو مطلق خبر نہ تھی کہ قلعے سے باہر کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ آئیے اب ذرا پھر ماضی کی طرف چلیں۔

اس قسم کے نالائق بادشاہوں کے زیر سایہ فتنوں کا سر اٹھانا قدرتی امر تھا چنانچہ طالع آزما سرداروں نے جب دیکھا کہ تیموری شہزادے ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں۔ بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا ہے اور ان سرداروں کی امداد سے اقتدار کا خواہاں ہے تو انہوں نے اپنی امداد کی دل کھول کر قیمت وصول کی۔ چنانچہ سید عبداللہ، سید حسین علی، نظام الملک آصف جاہ، اعتماد الملک غازی الدین خاں، برہان الملک سعادت خاں، نجف خاں، صفدر جنگ اور شجاع الدولہ نے اپنا اپنا اقتدار قائم کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ روہیلکھنڈ میں افغان سردار اپنی آزاد ریاستیں قائم کرنے اور انہیں قائم رکھنے میں مصروف تھے۔ اس کوشش میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کی ہر تمیز ختم کر دی گئی۔ ہر ایک کا مقصد و مدعا صرف ایک تھا کہ اس کی ریاست قائم ہو جائے۔ اگر قائم ہو گئی ہے تو اسے دوام نصیب ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے ان لوگوں نے مرہٹوں اور ہندو جاٹوں تک سے امداد حاصل کی حتی کہ بیرونی طاقتوں سے سازش کرنے میں بھی کوئی شرم محسوس نہ کی۔ ہندوستان پر نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملے اور پھر اس ملک میں انگریزوں کا عمل دخل یہ سب واقعات انہی طالع آزما امراء کی خودغرضی و سازش اور ملک و ملت سے غداری کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوئے۔ آئیے برصغیر کی تاریخ کے اس سیاہ ترین دور کا ایک سرسری جائزہ لیں۔

مرہٹوں کی غارت گری

مرہٹے جنوبی ہند کے علاقہ مہاراشٹر کے باشندے تھے۔ کھیتی باڑی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ سب سے پہلے گولکنڈہ اور بیجاپور کے مسلمان حکمرانوں نے انہیں فوج میں بھرتی کیا۔ یہ دونوں مسلمان حکمران ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے۔ اپنے

حریف کو نیچا دکھانے اور اسے ذلیل کرنے کے لئے دونوں نے مرہٹوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا۔ اس طرح مسلمان سلاطین نے ان کے حوصلے بلند کئے۔ ان کے ہاتھ سے ہل لے کر تلوار پکڑائی۔ ان میں جرات پیدا کی۔ انہیں بڑے بڑے منصب دیئے۔ جاگیریں عطا کیں حتیٰ کہ ان کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ چنانچہ ایک مورخ لکھتا ہے کہ ”اسلامی درباروں میں اس لئے بھی مرہٹوں کو باریاب ہونے کا موقع ملا کہ وہ (دکن کے) اکثر سلاطین کے ساتھ رشتہ داری کا تعلق رکھتے تھے اور ان کی ہم قوم عورتیں شاہی محلوں میں بادشاہ بیگم بنی ہوئی تھیں۔ دکن کی تین بڑی سلطنتوں کے اکثر فرماں روا مرہٹن ماؤں کے بیٹے اور مرہٹن دادیوں کے پوتے تھے“۔(4)

جب اورنگ زیب نے جنوبی ہند کی ریاستوں گولکنڈہ اور بیجاپور پر حملہ کیا تو ان مسلمان سلاطین نے اورنگ زیب کو زک دینے کے لئے مرہٹوں کو استعمال کیا۔ چنانچہ ان مسلم ریاستوں کی طرف سے مرہٹہ سرداروں کو روپیہ، سامان رسد اور اسلحہ جنگ دے کر اورنگ زیب کے لشکروں پر حملے کرنے کی خدمت تفویض کی گئی۔ مرہٹے کھلے میدان میں جم کر لڑنے کی ہمت و جرات سے عاری تھے اس لئے چھپ چھپ کر عالم گیری لشکروں پر حملے کرتے اور لوٹ مار کر کے بھاگ جاتے۔ ابتدا میں اورنگ زیب کے سامنے تو ان کی پیش نہ جا سکی مگر پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہی مرہٹے خود اورنگ زیب کے عہد حکومت میں سیواجی کی زیر قیادت گولکنڈہ پر حملہ آور ہوئے۔ شہروں اور قصبات کو تاراج کیا اس کے بعد گولکنڈہ کے حکمران سے چوتھ وصول کر کے واپس ہوئے۔

یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ خود اورنگزیب نے سیواجی کے پوتے ساہوجی ابن سنبھاجی کی پرورش کا خاص اہتمام کیا۔ اسے منصب و جاگیر سے نوازا اور شہزادوں کی طرح اس کی تربیت کی۔ (5) یہ ساہوجی آگے بڑھ کر اورنگ زیب کے جانشینوں کے لئے بڑی مصیبتوں کا باعث ثابت ہوا۔

جب اورنگ زیب کے بیٹوں شہزادہ معظم اور شہزادہ اعظم کے درمیان اقتدار کی جنگ ہوئی تو شہزادہ اعظم نے ساہوجی مرہٹہ کی خدمات حاصل کیں۔ اسے ہفت ہزاری کے منصب پر فائز کیا اور پانچ ہزار سوار رکھنے کی عزت عطا کی۔ خلعت فاخرہ سے نوازا اور

صوبہ اورنگ آباد کا ایک ضلع بطور جاگیر اسے عنایت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ شہزادہ اعظم مرہٹوں کے ذریعے سے اپنے بھائی شہزادہ معظم کو شکست دے کر ہندوستان کا تخت سلطنت حاصل کر لے لیکن ہوا کیا؟ اورنگ زیب کے اقتدار پرست بیٹوں کو خانہ جنگی میں الجھا ہوا دیکھ کر مرہٹوں نے ان تمام قلعوں اور علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا جو اورنگ زیب نے بڑی جان فشانی سے فتح کئے تھے۔ معظم اور اعظم کی جنگ میں جب شہزادہ معظم کو کامیابی حاصل ہوئی تو اس نے اپنے وزیر سلطنت ذوالفقار خاں کی سفارش پر ساہوجی مرہٹہ کو باقاعدہ سند حکومت عطا کر دی۔

مرہٹوں کو دہلی کا راستہ دکھانے والا

فرخ سیر کے عہد حکومت میں مرہٹوں نے اور بھی قوت حاصل کر لی۔ جب سید برادران (سید عبداللہ، سید حسین علی) نے فرخ سیر کو معزول کرنے کی مہم کا آغاز کیا تو سید حسین علی نے بھی مرہٹوں کی خدمات حاصل کیں۔ وہ اورنگ آباد سے ایک لشکر جرار لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ لشکر پچیس ہزار سواروں، دس ہزار برق اندازوں اور بہت بڑے توپ خانے پر مشتمل تھا۔ اس لشکر میں نصف سے زیادہ مرہٹے شامل تھے۔ بالاجی بشواناتھ، سنتاجی اور کھانڈے راؤ جیسے مرہٹہ سردار سید حسین علی کے ساتھ تھے۔ ان میں سے بارہ تیرہ ہزار سوار تو صرف کھانڈے راؤ کی کمان میں تھے۔ برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مرہٹے دکن کی حدود سے نکل کر دارالسلطنت دہلی میں داخل ہوئے اور وہ بھی ایک مسلمان سردار سید حسین علی کی قیادت میں۔ **انا للہ و انا الیہ راجعون ط۔**

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی مرہٹوں کی امداد سے فرخ سیر کو ٹھکانے لگانے کے بعد سید حسین علی نے اپنے ان ”محسنوں“ کو معقول صلہ بھی دیا یعنی نئے بادشاہ کے دستخط سے جو صرف کاٹھ کا بادشاہ تھا ساہوجی مرہٹہ کو قیمتی خلعت، دس ہزاری منصب کا پروانہ اور اس مضمون کا اجازت نامہ بھیجا کہ ساہوجی دکن کے علاقوں سے چوتھ وصول کر سکتا ہے۔ مزید اختیار دیا کہ سیواجی اپنی وفات کے

وقت جن علاقوں پر قابض تھا ان سب پر ساہوجی قبضہ کر سکتا ہے۔ یہ علاقے اس کی مستقل ریاست قرار دیدیئے گئے۔ (6)

اس طرح ایک مسلمان امیر اور سردار سید حسین علی نے دکن میں مرہٹوں کی سلطنت از سرنو قائم کی اور اسے سرکاری طور پر تسلیم بھی کر لیا تاکہ اس ریاست کے ذریعے وہ اپنا اقتدار قائم رکھ سکے خواہ مسلمانوں کی مرکزی طاقت خاک میں مل جائے۔ فرخ سیر کو شکست دے کر معزول کرنے کا جرم صرف سید حسین علی اور سید عبداللہ ہی نے نہیں کیا بلکہ دربار دہلی کے متعدد امرا ان سید بھائیوں کے ساتھ تھے۔ ان میں سے تاریخ نے جن طاقتور سرداروں کے نام محفوظ کر لئے ان میں چین قلیج خاں نظام الملک اول' اعتمادالدولہ محمد امین خاں اور فرخ سیر کا خسر راجہ اجیت سنگھ شامل ہیں۔ یہ وہ راجپوت راجہ ہے جس نے خوشی خوشی اپنی دختر بادشاہ فرخ سیر کے نکاح میں دی تھی اور پھر وہی اسے بیوہ کرنے والوں میں شامل ہو گیا۔

نادر شاہ کو دعوت

ناصرالدین محمد شاہ کی حکومت کو پوری طرح استحکام نصیب نہ ہوا تھا کہ ہندوستان کی مسلم ریاست کو ایک اور صدمہ سے دوچار ہونا پڑا جس نے اس کی جڑیں ہلا دیں اور پھر یہ سلطنت کبھی نہ سنبھل سکی۔ یہ صدمہ بھی مسلم ریاست کو اپنوں ہی کے ہاتھوں پہنچا۔ تاریخ کی یہ حقیقت ابھی تک عام لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے کہ نادر شاہ کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟ اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ جب نادر شاہ نے قندھار پر قبضہ کر لیا اور وہ کابل کی طرف بڑھا تو ناصر خاں نے جو بادشاہ دہلی کی طرف سے کابل کا گورنر تھا نہ صرف اس کی اطاعت اختیار کر لی بلکہ اسے ہندوستان جانے کی تحریک کی۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "نظام الملک' قمرالدین خاں اور زکریا خاں (گورنر لاہور) نے نادر شاہ سے درخواست کی کہ آپ تشریف لائیں اور ہندوستان کا فساد مٹائیں اور ہمارے

رقیبوں کو خاک میں ملائیں ہم پچاس کروڑ کا بندوبست اس تکلیف فرمائی کے عوض کر دیں گے۔ 1738ء میں نادر شاہ لاہور پہنچا۔ پنجاب کے صوبیدار (گورنر) زکریا خاں نے نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی فرماں برداری کا یقین دلایا۔ نادر شاہ نے پنجاب کی حکومت (پھر) اس کے سپرد کر دی اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر نظام الملک اور وزیر سلطنت قمرالدین خاں بادشاہ کے ہمراہ نادر شاہ کے مقابلے پر نکلے مگر ان دونوں نے نہ فراہمی فوج کو ضروری سمجھا نہ کسی قسم کی تیاری کی بلکہ بادشاہ کو لیت و لعل میں رکھ کر وقت کا بڑا حصہ ضائع کر دیا۔ (7)

اس خیال کو تقویت بعض اور مورخوں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے کہ بادشاہ دہلی کے بعض امراء نادر شاہ سے سازش کر رہے تھے ان لوگوں نے اسے ہندوستان بلایا اور دہلی پر حملہ آور ہونے کی دعوت دی۔ دربار کے لوگ پرلے درجے کے ست اور غبی تھے اور بادشاہ کو تاریکی میں رکھنے کے بھی مجرم تھے۔ چنانچہ مولانا ہاشمی فرید آبادی اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ نادر شاہ کا لشکر جرار طوفان بادوباراں کی طرح شہر پر شہر فتح کرتا چلا آ رہا تھا یہاں دہلی کے لال قلعے کا یہ حال تھا کہ جب نادر شاہ کے غلبہ افغانستان کی خبر آئی تو محمد شاہ کے ایک فوجی سردار نے اسے مذاق سمجھا اور خبر لانے والے سے کہا کہ "شاید تمہارے مکان بہت بلندی پر واقع ہیں کہ اتنی دور سے دیکھ لیا"۔ بعض سردار یہ کہہ کر دل خوش کر لیتے تھے کہ یہ حرکت لاہور کے صوبیدار (گورنر) زکریا خاں کی ہے جو ہوائی خبریں اڑاتا ہے۔ ادھر نادر شاہ کے قاصد محمد شاہ کے پاس آ رہے تھے کہ اس سے معاملات طے کرو۔ درباری امراء انہیں مصنوعی قاصد قرار دے کر بادشاہ کو دھوکے میں رکھ رہے تھے۔ اس بات کے قوی قرائن موجود ہیں کہ نادر شاہ کو دہلی پر حملہ کرنے کی دعوت خود محمد شاہ کے ایک سردار اور اودھ کے صوبیدار (گورنر) برہان الملک سعادت علی خاں نے دی تھی۔ بظاہر تو وہ محمد شاہ کے لشکر میں شامل تھا' بادشاہ اور سپہ سالار خان دوران دونوں نے اسے ہدایت کر دی تھی کہ مورچوں سے باہر جا کر نادر شاہ کی فوج پر حملہ نہ کرے مگر اس نے ایک نہ سنی۔ مورچوں

سے اپنا لشکر لے کر باہر نکلا اور جیسے ہی ایک قزلباش نے اسے للکارا فوراً ہتھیار ڈال کر خود کو گرفتار کروا دیا۔ اس کے بعد وہ مع اپنے لشکر کے نادر شاہ سے مل گیا۔

جب نادر شاہ نے دہلی کے قلعے اور شاہی عمارات پر قبضہ کیا تو اس اقدام کی رہنمائی صوبیدار اودھ سعادت علی خاں نے ہی کی۔ اس کے بعد دہلی میں وہ لوٹ مار مچی کہ نادر شاہی لوٹ محاورے کی شکل اختیار کر گئی۔ بڑی بڑی حویلیاں تاراج کر دی گئیں۔ ایک لاکھ کے قریب اہل شہر قتل ہوئے۔ بوڑھے، بچے، عورتیں سب بلاامتیاز نادر شاہی تلواروں کا نشانہ بنے۔ شہر کھنڈر بن گیا۔ بڑے بڑے چوک، تجارتی منڈیاں لوٹ لی گئیں۔ عمارتوں میں آگ لگا دی گئی۔ نادر شاہ نے اپنے بیٹے کے لئے محمد شاہ کی بیٹی کا انتخاب کیا اور شادی کر کے لوٹ کے مال کے ساتھ اسے بھی لے گیا۔ جب نادر شاہ ہندوستان سے واپس گیا تو دہلی میں الو بول رہا تھا اور درودیوار پر خون سے یہ الفاظ لکھے تھے کہ "مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو گیا" نادر شاہ کے حملے نے مغلیہ سلطنت کا وقار خاک میں ملا دیا۔ سکھ، جاٹ اور مرہٹے جو کسی حد تک دب گئے تھے نادر شاہ کے ہاتھوں محمد شاہ کی شکست دیکھ کر پھر میدان میں نکل آئے۔ (8)

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا گیا کہ دہلی پر نادر شاہ کو حملہ کرنے کی دعوت دینے میں کیا اودھ کے گورنر برہان الملک سعادت علی خاں کا بھی ہاتھ تھا؟ اس کی تائید و تصدیق ایک اور فاضل مورخ کی رائے سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "سعادت خاں (والئی اودھ) کی پیشانی پر یہ بدنامی کا داغ ضرور رہا کہ انہوں نے نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کو برباد کروایا"۔ (9)

اردو تاریخوں کے علاوہ اس عہد کے مورخوں نے اپنی فارسی کتابوں میں بھی دہلی کی بربادی، سلطنت تیموریہ کی تباہی اور ایک لاکھ کے قریب مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل کا ذمہ دار برہان الملک نواب سعادت علی خاں والئی اودھ کو قرار دیا ہے چنانچہ ایک فارسی تاریخ نویس لکھتا ہے کہ نادر شاہ کو سعادت

علی خاں نے اس بات پر اکسایا کہ کرنال کے میدان قتال سے (جہاں محمد شاہ اور نادر شاہ کی فوجوں کا مقابلہ ہوا تھا) دہلی کا رخ کرے اور دعوت کھانے کے بہانے قلعے میں داخل ہو جائے ورنہ نادر شاہ کا ہرگز ایسا ارادہ نہ تھا اصل فارسی الفاظ یہ ہیں "الا ارادہ نادر شاہ چنیں نبود" (10) نواب سعادت علی خاں کے انتقال پر شاعر نے جو تاریخ کہی اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں سعادت علی خاں کا یہ جرم مشہور و معروف ہو چکا تھا چنانچہ شاعر کہتا ہے ع

"بے سعادت نمک حرام بمرد" (11)

نادر شاہ کے ہاتھوں دہلی کو لٹوانے کی یہ شرمناک حرکت نواب سعادت علی خاں نے کیوں کی؟ ایک اور فارسی مورخ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے۔" دوسرے دن بادشاہ محمد شاہ نے بخشی گری (وزیر سلطنت) کا عہدہ و خلعت نظام الملک فتح جنگ کو مرحمت فرمایا۔ برہان الملک سعادت علی خاں کہ اس عہدہ کا امیدوار تھا محمد شاہ سے بگڑ گیا اور نادر شاہ کو ترغیب دلا کر دہلی لایا اور ان خزانوں اور دفینوں کا پتہ بتایا جو مختلف مقامات پر دفن تھے"۔ (12)

مختصر یہ کہ فارسی مورخ تسلیم کرتے ہیں کہ نواب سعادت علی خاں نے ذاتی انتقام لینے اور عہدہ و منصب حاصل کرنے کے لئے اپنے آقا سے غداری کی اور دہلی کو برباد کروایا حالانکہ آصف جاہ نظام الملک 2 کروڑ روپے دے کر نادر شاہ کو ہندوستان سے واپس جانے پر آمادہ کر چکا تھا (کیونکہ نظام الملک کا مقصد پورا ہو گیا تھا اور اسے نادر شاہ نے بادشاہ محمد شاہ سے امیرالامرائی (وزیر سلطنت) کا عہدہ دلوا دیا تھا) جب برہان الملک سعادت علی خاں صوبیدار اودھ نے یہ خبر سنی کہ وزیر سلطنت کا عہدہ اس کی بجائے نظام الملک کو دے دیا گیا ہے تو اس نے نادر شاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ "نظام الملک نے 2 کروڑ کی جو رقم آپ کی خدمت میں پیش کی ہے اتنی رقم تو میں اپنے ذاتی خزانے سے نذر کر سکتا ہوں۔ میرے علاوہ دلی امراء، مہاجنوں اور شاہی خزانے سے بھری پڑی ہے"۔ فارسی الفاظ یہ ہیں "از حساب بیرون است" (13) اگر آپ دلی چلیں تو آپ کا مقصد بہت عمدگی سے

حاصل ہو گا۔ یہ سن کر نادر شاہ برہان الملک سعادت علی خاں سے بہت خوش ہوا۔ اسے خلعت عطا کیا اور بادشاہ کی نیابت کے جملہ اختیارات عطا فرما دیئے۔

ان تصریحات سے بخوبی ثابت ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے امراء اور صوبوں کے گورنر کس قدر خودغرض تھے۔ یہ لوگ ذاتی مفاد اور حصول اقتدار کی خاطر بیرونی طاقتوں سے سازباز کرنے سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ نادر شاہ کو ہندوستان بلوانے اور دہلی پر چڑھائی کروانے میں نظام الملک آصف جاہ، نواب زکریا خاں گورنر لاہور اور برہان الملک نواب سعادت علی خاں گورنر اودھ برابر کے شریک اور ذمہ دار تھے۔ اس واقعے کے بعد تیموری سلطنت کا وقار ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا اور غیر مسلم طاقتیں للچائی ہوئی نظروں سے ہندوستان کے تخت و تاج کی طرف دیکھنے لگیں بلکہ انہیں بادشاہی مقبوضات پر حملہ کرنے اور قبضہ کرنے کی جرات پیدا ہوئی۔

محمد شاہ اور سید برادران

محمد شاہ بادشاہ جوان بھی تھا اور شروع میں عالی حوصلہ بھی۔ اس کی کوشش تھی کہ بادشاہت کو سرکش امراء کے قبضہ و اختیار سے نکال کر بادشاہ کی آزادانہ خودمختارانہ حیثیت بحال کرے مگر افسوس کہ اس بادشاہ نے بھی اس مقصد کے حصول کے لئے جو بلاشبہ بہت اچھا اور بلند تھا مرہٹوں کی امداد حاصل کی اور ان کا سہارا لیا۔ اس نے سید حسین علی کو جو دکن کا گورنر تھا بے دست و پا کرنے کے لئے مرہٹوں کو خفیہ پیغام بھیجا کہ سید حسین علی کے احکام کی تعمیل نہ کی جائے۔ اس کی طاقت کو کمزور کیا جائے۔ مرہٹوں کو بہانہ چاہئے تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بادشاہ ان کی سرپرستی کر رہا ہے تو وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر اور تلوار ہاتھوں میں لے کر سارے دکن میں پھیل گئے اور ہر طرف لوٹ مار سے تباہی مچا دی۔ اسی دوران میں اودھ کا گورنر برہان الملک سعادت علی خاں سید حسین علی سے بدظن ہو گیا۔ دونوں کے تعلقات اس حد تک خراب ہو گئے کہ اس نے سید

حسین علی کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ برہان الملک سعادت علی خاں، سید حسین علی سے خائف تھا اور اسے اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتا تھا۔ سعادت علی خاں کو بادشاہ محمد شاہ اور سید حسین علی کے تعلقات کی کشیدگی کا پہلے ہی علم تھا۔ چنانچہ محمد شاہ اور سعادت علی خاں کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سید حسین علی کا کام تمام کر دیا گیا۔ کہتے ہیں کہ سید حسین علی جب بادشاہ سے رخصت ہو کر دکن جا رہا تھا تو راستے میں ایک تیموری سردار نے خنجر سے اسے قتل کر دیا۔ اسی عہد کا ایک بڑا مورخ لکھتا ہے کہ "سید حسین علی کو محمد امین نیشاپوری کی سازش سے قتل کیا گیا"۔ (14) یہ وہی محمد امین نیشاپوری ہے جو بعد میں برہان الملک سعادت علی خاں کے لقب سے مشہور ہوا اور سلطنت اودھ کا بانی کہلایا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بادشاہ کے ایرانی اور تورانی امراء ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نہ تھے بلکہ حصول اقتدار کی خاطر ایرانی سردار خود ایرانی سرداروں کا خون بہانے سے بھی دریغ نہ کرتے تھے۔

اپنے بھائی کے قتل کی خبر سن کر سید عبداللہ نے جو بڑا طاقتور اور بااثر سردار تھا ایک ماہ کی قلیل مدت میں نوے ہزار سوار بھرتی کر لئے اور محمد شاہ کے مقابلے میں بہادر شاہ اول (شہزادہ معظم) کے پوتے ظہیرالدین کو بادشاہ بنایا اور سلطان ابراہیم کا لقب دیا۔ (15) متھرا کے قریب حسن پور نامی مقام پر محمد شاہ اور سید عبداللہ کا مقابلہ ہوا۔ جمعیت کثیر کے باوجود سید عبداللہ کو شکست ہوئی۔ بادشاہ محمد شاہ نے سلطان ابراہیم اور سید عبداللہ کو گرفتار کر لیا مگر دونوں کی جاں بخشی کر دی صرف اسیری کی سزا دی۔ کہتے ہیں کہ بعض حریف امراء کی سازش سے سید عبداللہ کو دوران اسیری زہر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔

محمد شاہ اور نظام الملک

محمد شاہ سید برادران کا قلع قمع کرنے میں تو کامیاب ہو گیا مگر حکومت دہلی

کے خلاف جو سیلاب امنڈ رہا تھا اس کا ایک بڑا اور زبردست دھارا محمد شاہ کے روکے نہ رک سکا۔ یہ دھارا تھا چین قلیچ خاں نظام الملک کی افسوسناک روش۔ محمد شاہ اور نظام الملک کے تعلقات کیسے خراب ہوئے؟ یہ ایک طویل کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ بعض امراء نے محمد شاہ کو نظام الملک سے بدظن کر دیا کہ یہ امیر دکن میں اپنی آزاد و خودمختار ریاست قائم کرنے کی فکر میں ہے (اور یہ بات درست ثابت ہوئی) نظام الملک نے محسوس کیا کہ بادشاہ اس کے حریف امراء کے زیر اثر ہے چنانچہ اس نے مرکز سے دور دراز علاقے دکن میں جا کر جہاں کا وہ گورنر رہ چکا تھا اپنی آزاد ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مالوہ پہنچ کر اس نے گجرات کے گورنر حامد خاں سے رابطہ قائم کیا۔ حامد خاں نظام الملک کا چچا اور ایک طاقتور سردار تھا اس نے اپنے بھتیجے کی پوری امداد کی۔ نظام الملک نے اسے مشورہ دیا کہ اس مقصد کے لئے مرہٹوں سے بھی امداد حاصل کرو۔ اپنے ایک اور رشتہ دار عضدالدولہ عوض خاں کو واسطہ بنا کر ساہوجی مرہٹہ سے ایک معاہدہ کیا اور اسے اس شرط پر مالوہ اور گجرات کے صوبوں سے چوتھ وصول کرنے کا حق دے دیا کہ بادشاہ کے حامی سرداروں کا قلع قمع کرنے میں ہمارا ساتھ دو۔ چنانچہ مشہور مرہٹہ سردار پیلوجی گائیکواڑ کی سرکردگی میں مرہٹوں نے صوبہ گجرات کی رعایا کو اس بری طرح لوٹنا شروع کیا کہ قصبات اور شہروں کے متمول باشندوں کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا اور دیہات کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا۔ (16) ایک روایت کے مطابق مرہٹوں کی تیس ہزار فوج نے صوبہ گجرات میں دیہات اور قصبات کو تاخت و تاراج کر ڈالا اور احمد آباد تک سارے علاقے کو ویران کر دیا۔ خصوصاً گجرات پر تو بڑی تباہی نازل ہوئی۔

نظام الملک کی شکست

بظاہر نظام الملک کو محمد شاہ کے مقابلے میں کامیابی ہوئی اور وہ مرہٹوں کی امداد سے دکن میں اپنی آزاد و خودمختار حکومت قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر

یہی مرہٹے پھر اس کے لئے وبال جاں بن گئے۔ 1729ء میں نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نظام الملک کو مرہٹوں کے خلاف میدان جنگ میں آنا پڑا۔ اس جنگ میں نظام الملک نے شکست کھائی۔ شکست ان معنی میں کہ اس نے باجی راؤ سے اس کی شرائط پر دب کر صلح کی۔ ایک مورخ کے بقول اس فتح سے باجی راؤ کی تمام دکن میں دھاک بیٹھ گئی اور غیر مسلموں کے دلوں سے مسلمانوں کا رعب جاتا رہا۔ اب نظام الملک کو باجی راؤ سے اتنا خطرہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے باجی راؤ سے ایک معاہدہ کیا جس کی رو سے مرہٹوں نے عہد کیا کہ وہ نظام الملک کے علاقوں میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔ اس کے عوض نظام الملک نے ایک مقررہ رقم سالانہ باجی راؤ کو ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے باجی راؤ سے یہ بھی وعدہ کیا کہ مرہٹے ہندوستان کے دوسرے صوبوں پر جب حملہ کریں گے تو نظام الملک ان میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ نظام الملک کی عاقبت نااندیشی اور خودغرضی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرہٹے سارے ہندوستان میں پھیل گئے۔ 1736ء میں باجی راؤ، تغلق آباد پالم پور اور ریواڑی تک لوٹ مار کر کے واپس بھی چلا گیا مگر کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکا۔ "تاریخ مرہٹہ" کا مولف لکھتا ہے کہ وہ (باجی راؤ) ملک کے جن جن حصوں میں ہو کر آیا اور جن جن اضلاع میں ہو کر وہ واپس گیا کہیں اس نے ٹھوکر نہیں کھائی اور کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ تیرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ آخر یہ کیا بات ہے کہ صوبہ داروں، فوج داروں، عاملوں اور فوجی سرداروں میں سے کوئی حرکت نہ کر سکا حالانکہ اورنگ زیب کی وفات کو ابھی صرف تیس سال گزرے تھے۔

بنگال کا المیہ

بنگال کے صوبیدار شجاع الدولہ اسد خاں نے حکومت دہلی سے سرکشی اختیار کی اور بنگال، بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کر لیا۔ سیرالمتاخرین کے مصنف غلام حسین طباطبائی نے (جن کے والد شجاع الدولہ اسد خاں اور ان کے خاندان کے

نمک خوار تھے) اپنی کتاب میں اعتراف کیا ہے کہ شجاع عورتوں کے بغیر چار گھنٹے بھی نہیں گزار سکتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے خاص معتمدین کی خدمات حاصل کی تھیں جن میں ایک حاجی احمد تھے۔ اس شخص کا کام ہی یہ تھا کہ شجاع الملک کے لئے خوبصورت اور جوان عورتیں فراہم کیا کرتا تھا۔ حاجی احمد نے ان خاندانوں کی عورتوں کو پکڑ پکڑ کر شجاع کے پاس بھجوایا جن کے اکابر سے حاجی احمد کی مخالفت و مخاصمت تھی اس طرح اس شخص نے امراء کی عورتوں کو بے آبرو کروایا۔ یہی کیفیت شجاع الدولہ اسد خاں کے بیٹے سرفراز خاں کی تھی۔ اس کا محل خوبصورت اور جوان عورتوں سے بھرا ہوا تھا مگر ان میں سے ایک بھی سرفراز خاں کی منکوحہ نہ تھی۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان سے سرفراز خاں کی اولاد بھی تھی۔ یہ تھی ان مسلمان حکمرانوں کی اخلاقی حالت؟

شجاع الدولہ اسد خاں کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا سرفراز خاں بنگال کا حاکم مقرر ہوا اور بادشاہ دہلی نے اس کی رسمی منظوری بھی عطا کر دی۔ مگر نواب علی وردی خاں جو شجاع الدولہ اسد خاں کی طرف سے بہار کا گورنر تھا۔ اپنے آقا زادے کے خلاف میدان میں آگیا۔ دونوں کے درمیان جنگ ہوئی جس میں سرفراز خاں مارا گیا اور علی وردی خاں بنگال، بہار اور اڑیسہ کا حاکم بن گیا۔ یہ جنگ ختم ہوئی تھی کہ اڑیسہ کے صوبیدار مرشد قلی خاں اور علی وردی خاں میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں بھی علی وردی خاں نے فتح پائی۔ مرشد قلی خاں کے بھتیجے مرزا باقر علی نے اپنے چچا کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے علم بغاوت بلند کیا۔ پھر ایک افغان سردار مصطفیٰ خاں اور علی وردی خاں باہم نبرد آزما ہوئے۔ بنگال کی اس خانہ جنگی نے مرہٹوں کو حوصلہ دلایا۔ سب سے پہلے سرفراز خاں ابن شجاع الدولہ اسد خاں اور مصطفیٰ خاں نے مرہٹوں کو بنگال پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ انتہا یہ ہے کہ بنگال کے ایک سردار میر حبیب نے جو علی وردی خاں سے شدید عداوت رکھتا تھا مرہٹوں کو عین اس وقت روک لیا جب وہ لوٹ مار کے بعد موسم کی خرابی کی وجہ سے دکن واپس جانا چاہتے تھے۔ میر حبیب نے انہیں واپس بلوا

کر ہگلی کے قلعے پر ان کا قبضہ کروایا۔ اس طرح بردوان، میدنی پور اور بالیسر تک ان کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اڑیسہ پر حملہ کیا اور وہاں کا صوبیدار شیخ محمد معصوم مرہٹوں سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اڑیسہ چھوڑ کر نکل بھاگا۔ راج شاہی اور کچھ دیگر پرگنوں پر بھی مرہٹوں کا قبضہ ہو گیا۔ مرہٹے ہر روز ان علاقوں کے دیہات کو لوٹ لیتے اور دس دس کوس تک دھاوے کر کے ہر طرف آگ لگا دیتے۔ میلوں تک فصلوں اور آبادیوں کا نام و نشان باقی نہ چھوڑتے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب علی وردی خاں نے مدت تک مرہٹوں کا بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخرکار ان کے ہاتھوں مجبور ہو کر اڑیسہ کا صوبہ ان کے حوالے کر دیا۔ (17) اس طرح بنگال کے مسلمان سرداروں کی خانہ جنگی اور سرکشی نے نہ صرف ہندوستان کی مرکزی حکومت کو کمزور کیا بلکہ انہیں مرہٹوں کا خراج گزار بنانے کے علاوہ انگریزوں کے ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہونے کا راستہ بھی ہموار کیا۔

احمد شاہ ابدالی کی تباہ کاریاں

محمد شاہ بادشاہ دہلی کے بیٹے احمد شاہ کے عہد حکومت میں تیموری سلطنت کی رہی سہی ساکھ احمد شاہ ابدالی نے ختم کر دی۔ عجیب بات ہے کہ نادر شاہ ایرانی کی طرح احمد شاہ ابدالی کو بھی ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت خود تیموری سلطنت کے غدار امراء نے دی۔ ان میں دو آبہ جالندھر کا صوبیدار آدینہ بیگ اور لاہور کا صوبیدار شاہنواز خاں شامل ہیں۔ ایک مورخ کے بقول "احمد شاہ ابدالی نے تاج حکومت سر پر رکھتے ہی مغلیہ ہندوستان کی طرف نگاہ دوڑائی۔ وہ نادر شاہ کے ہمراہ 39-1738ء میں یہاں آیا تھا۔ یہاں کی حکومت کی کمزوری اور اکابر سلطنت کی آرام طلبی کی بنا پر اسے یقین تھا کہ دوڑ دھوپ کے بعد وہ بآسانی نہ صرف مغلوں کے خزانوں کا وارث بن سکتا ہے بلکہ تمام ہندوستان پر قبضہ جما سکتا ہے۔ اس نے جلد ہی صوبہ کابل کو (جو اس وقت تک مغلیہ سلطنت کا ایک حصہ

تھا) ناصر خاں سے چھین لیا اور دریائے سندھ سے لے کر خراسان تک تمام
علاقے کا فرماں روا بن گیا"۔ (18)

اس طرح احمد شاہ ابدالی نے بلا کسی وجہ کے محض حصول دولت و اقتدار
کی ہوس میں مسلمانوں کی ایک آزاد و خودمختار مملکت پر حملہ کیا اور اسے سخت
نقصان پہنچایا۔ یہ وہ دور تھا جب صوبہ پنجاب کی گورنری کے لئے دو امیدواروں
یحییٰ خاں اور شاہنواز خاں میں کشمکش جاری تھی یہ دونوں حقیقی بھائی تھے۔ دونوں
میں خون ریز جنگ ہوئی اور یحییٰ خاں کو شکست دے کر شاہنواز خاں پنجاب پر
قابض ہو گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ہر وقت خوف رہتا تھا کہ معلوم نہیں
کب مرکزی حکومت کی طرف سے اس پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنے
دیرینہ رفیق اور دوآبہ جالندھر کے صوبیدار آدینہ بیگ کے مشورے پر افغانستان
کے حکمراں احمد شاہ ابدالی کو اپنی امداد کے لئے خط لکھا۔ احمد شاہ ابدالی پنجاب کے
حکمراں کی طرف سے امداد کی درخواست پا کر بے حد خوش ہوا۔ اس نے شاہنواز
خاں کے سفیر سے دوستی اور تعاون کا معاہدہ طے کیا جس پر سفیر اور احمد شاہ ابدالی
کے امراء نے دستخط کئے۔ اس کے بعد وہ اٹھارہ ہزار افغانوں کا لشکر لے کر پنجاب
کی طرف روانہ ہو گیا۔ ادھر شاہنواز خاں کے ماموں قمرالدین خاں وزیر ہند کو
جب اپنے بھانجے کی اس غدارانہ روش کا علم ہوا تو اس نے شاہنواز خاں کو ایک
تہدید آمیز خط لکھ کر اس حرکت سے روکا۔ شاہنواز خاں پر خط کا اثر ہوا اور اس
نے احمد شاہ ابدالی سے کیا ہوا معاہدہ توڑ دیا۔ جب احمد شاہ ابدالی کا سفیر ہارون
خاں سدوزئی لاہور پہنچا اور یہاں کا بدلا ہوا رنگ دیکھا تو اس نے واپس جا کر احمد
شاہ ابدالی کو نئے حالات سے مطلع کیا۔ احمد شاہ ابدالی شاہنواز خاں کو اس کی عہد
شکنی کی سزا دینے کے بہانے سے شاہدرہ پہنچا۔ پھر شالامار باغ کے پاس خیمے نصب
کر دیئے۔ دونوں فوجوں میں جنگ ہوئی۔ شاہنواز خاں کثیر فوج اور توپ خانے کے
باوجود جنگ ہار گیا اور دہلی کو فرار اختیار کیا۔ ایک مورخ لکھتا ہے کہ "12 جنوری
1748ء کو احمد شاہ ابدالی بیگم پورہ (لاہور) میں داخل ہوا اور لوٹ مار اور قتل عام کا

حکم دے دیا۔ افغان سپاہ کو بیگم پورہ کے محلوں سے بے اندازہ دولت ملی اور
زروجواہر کے وہ ذخیرے جو ربع صدی سے جمع ہو رہے تھے آن واحد میں لٹ
گئے۔ خلق خدا بے دریغ نذر تیغ ہوئی"۔ (19)

احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر دس حملے کئے اور ہر حملے میں امتیاز مذہب
و ملت کے بغیر ہندوستان کے لوگ اس کی لوٹ مار کا نشانہ بنے۔ تیموری سلطنت
اتنی کمزور ہو گئی کہ ایک ضرب اسے ختم کرنے کے لئے کافی تھی۔ احمد شاہ ابدالی
کے حملوں میں سب سے خوفناک حملہ وہ تھا جس نے دارالسلطنت دلی کو ویران کر
دیا چنانچہ ہمارے عہد کے ایک مورخ ابدالی یورشوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں
کہ "1757ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا (عین اسی سال انگریزوں
نے پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال میں انگریزی
سلطنت کی بنیاد رکھی۔ یعنی بیک وقت و بیک سال ایک طرف ایک غیر ملکی دشمن
انگریز مشرقی جانب سے ہندوستان کا قبضہ حاصل کر رہا تھا اور دوسری طرف مغربی
جانب سے ایک دوسرا غیر ملکی حملہ آور (احمد شاہ ابدالی) تیموری سلطنت کو کمزور کر
رہا تھا۔ پیام) پنجاب میں کوئی اس کا راستہ روکنے والا نہ تھا چنانچہ وہ دہلی پر چڑھ
آیا۔ کامل اطمینان سے دو مہینے تک شہر کو لوٹا۔ خانہ تلاشی بلکہ جامہ تلاشی میں بھی
کوئی رو رعایت جائز نہ رکھی۔ بڑے بڑے امیروں کو محتاج و فقیر بنا دیا۔ عمائد شہر
کی وہ خواریاں بلکہ دل آزاریاں ہوئیں کہ بعض شریف خودکشی کر کے مر گئے۔
بہت سے منہ دکھانے کے قابل نہ رہے اور وطن عزیز کی سکونت چھوڑ کر جدھر
سینگ سمایا نکل گئے"۔ (20)

ایک اور فاضل مورخ ابدالی کے ہاتھوں دہلی کی تباہی کا ان الفاظ میں
نوحہ پڑھتا ہے۔ 28 جنوری 1757ء کو احمد شاہ ابدالی نے دہلی میں داخل ہو کر
بڑے بڑے امراء کے محلات لوٹ لئے۔ نواب قمرالدین خاں کے محل کو تاراج کر
دیا گیا۔ بے شمار لوگ قتل ہوئے۔ دہلی کی دو مغل شہزادیاں بھی اس لوٹ میں احمد
شاہ کے حصے میں آئیں۔ ان میں سے ایک عالم گیر ثانی کی بیٹی زہرہ بیگم تھی جس

سے احمد شاہ نے اپنے بیٹے تیمور شاہ کی شادی کر دی۔ دوسری شہزادی محمد شاہ کی دختر مقرب بیگم تھی۔ یہ سولہ سال کی خوبصورت شہزادی تھی اس سے خود احمد شاہ ابدالی نے بیاہ کر لیا۔ (21) اس طرح دلی سے لندھا پھندا اور نئی نویلی پری اندام دلہن کو ساتھ لے کر احمد شاہ ابدالی عازم افغانستان ہوا اور اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی داستان چھوڑ گیا۔

مسلمانوں کی ریاست کی یہ تباہی و بربادی کسی غیر مسلم کے ہاتھوں نہیں بلکہ ایک مسلمان حکمراں کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ مسلمان عورتوں اور شریف مردوں کی ذلت و خواری کوئی سکھ یا مرہٹہ نہیں بلکہ ایک غیر ملکی کلمہ گو کر رہا تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ احمد شاہ ابدالی کو اس حملے کی دعوت بھی تیموری سلطنت کے وابستگان ہی کی طرف سے دی گئی۔ یہ ایک خاتون مغلانی بیگم تھیں جو پنجاب کے مرحوم گورنر نواب معین الملک عرف میر منو کی بیگم تھیں۔ اس خاتون نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ "وزیر ہند نے پنجاب کی حکومت اس سے چھین لی ہے اور اسے میر مومن، آدینہ بیگ اور سید جمیل کی غداری نے تباہ کیا ہے۔ آپ اس کا بدلہ لینے کے لئے دہلی پر حملہ کریں۔ وہاں کے حالات دگرگوں ہیں۔ فتح و نصرت آپ کے قدم چومے گی۔ میرے خسر وزیر قمرالدین خاں کے محل میں کروڑوں روپے کا اثاثہ ہے۔ یہی حال دوسرے امراء کا ہے۔ یہ سب مال و دولت اپنی ملکیت سمجھے" (22)

ایسا معلوم ہوتا ہے احمد شاہ ابدالی موقع کا منتظر بیٹھا تھا ادھر اسے یہ خط ملا اور ادھر وہ اپنا لشکر جرار لے کر چڑھ دوڑا اور دارالسلطنت کو تاراج کر کے تیموری سلطنت کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک گیا۔

ان تباہ کاریوں کے باوجود احمد شاہ ابدالی نے سکھوں پر پے در پے حملے کر کے انہیں عبرتناک شکستیں بھی دیں اور حتی المقدور ان کی طاقت کو توڑ دیا۔ اس کا یہ کارنامہ بھی برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا عظیم الشان کارنامہ ہے کہ پانی پت کی تیسری جنگ میں اس شیر دل جرنیل نے مرہٹوں کو شکست فاش دے کر

ہندوستان پر راج کرنے کا مرہٹی خواب شرمندہ تعبیر نہ ہونے دیا بلکہ اسے خواب پریشان بنا دیا۔ اس ایک کارنامے کے علاوہ احمد شاہ ابدالی اور اس کے جانشینوں کے ہاتھوں ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے سکھوں کی طاقت توڑ کر پنجاب، پشاور اور کشمیر پر جو حکومت قائم کی تھی وہ اس کے نالائق جانشینوں کے ہاتھوں برباد ہو گئی اور اس کے پوتے زمان شاہ نے لاہور کی حکومت کا پروانہ رنجیت سنگھ کو عطا کر کے سکھوں کو پنجاب پر ایسا مسلط کیا کہ یہاں کے مسلمان پناہ مانگ اٹھے۔

صفدر جنگ اور غازی الدین خاں

اسی دوران صفدر جنگ ہندوستان کے مطلع سیاست پر نمودار ہوا۔ یہ برہان الملک سعادت علی خاں حاکم اودھ کا داماد تھا اور احمد شاہ بادشاہ دہلی کا وزیر سلطنت مقرر ہو چکا تھا۔ اس شخص کے ہاتھوں بھی ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت نقصان اور ذلت و رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔

یہی دور تھا جب روہیلکھنڈ کے افغان سردار طاقت پکڑ چکے تھے۔ خود بادشاہ ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔ صفدر جنگ روہیلہ سرداروں کو اپنے لئے سب سے بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے مسلمان بھائیوں کو نیچا دکھانے کے لئے آگرہ کے ایک طاقتور راجہ سورج مل جاٹ سے سازباز کی اور اسے اپنے روہیلہ حریف نواب احمد خاں حاکم فرخ آباد پر چڑھا لایا مگر نواب احمد خاں کے ہاتھوں سورج مل اور صفدر جنگ کی متحدہ فوجوں کو شکست ہوئی۔ اس ناکامی کے بعد صفدر جنگ نے مرہٹوں سے خط و کتابت شروع کی اور اپنے مسلمان حریف کو نیچا دکھانے کے لئے سندھیا اور ہلکر کو 35 ہزار روپیہ نقد دینے کا وعدہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ 1750ء میں نواب احمد خاں کو شکست ہوئی۔ صفدر جنگ کی قیادت میں مرہٹوں نے تمام روہیلکھنڈ میں پھیل کر تباہی مچا دی اور پہلی بار صفدر جنگ کی مہربانی سے مرہٹوں کا قدم روہیلکھنڈ میں آیا اور ان کی لوٹ مار سے یہ

سارا علاقہ بری طرح برباد ہو گیا۔

اب صفدر جنگ اور نظام الملک کے فرزند عماد الملک غازی الدین خاں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہوئی۔ برہان الملک علی سعادت خاں اور صفدر جنگ کی طرح عماد الملک غازی الدین خاں بھی ہماری تاریخ کا ایک ناسور تھا۔ پہلے صفدر جنگ نے روہیلوں کو نیچا دکھانے کے لئے مرہٹوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اب دکن کے حکمران عماد الملک غازی الدین خاں نے صفدر جنگ کو ذلیل کرنے کے لئے مرہٹوں کو استعمال کیا۔ انہیں گراں قدر رقم دے کر دارالسلطنت آنے کی دعوت دی اور ان کے ہاتھوں شہر کو بری طرح لٹوایا۔

1756ء میں عماد الملک غازی الدین خاں نے پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ غازی الدین خاں نے یہ کامیابی مرہٹوں کے ذریعے حاصل کی۔ مرہٹہ سردار رگھناتھ راؤ، شمشیر بہادر، ملہار راؤ ہلکر اور دتا جی سندھیا لشکر کثیر کے ساتھ غازی الدین خاں کے ہمراہ تھے۔ اب پنجاب پر مرہٹوں کی حکومت قائم ہو گئی۔ دہلی ان کی سب سے بڑی چھاؤنی تھی۔ حیرت ہوتی ہے کہ سکھ جو مسلمانوں کے سامنے شیر بنے ہوئے تھے مرہٹوں کے سامنے بے دست و پا ہو گئے اور چوہوں کی طرح بلوں میں گھس گئے۔

غازی الدین خاں کے ہاتھوں ہندوستان پر سب سے بڑی ضرب اس صورت میں پڑی کہ اس نے پہلے یعنی 1754ء میں بادشاہ دہلی احمد شاہ اور اس کی والدہ دونوں کو گرفتار کر لیا۔ پہلے احمد شاہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ پھر اس کی ماں کو پکڑا اس نے لاکھ منت سماجت کی مگر بے سود اس غریب کو بھی اندھا کر کے چھوڑا۔ اس کے بعد جہاں دار شاہ کے بیٹے عزیزالدین کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشیں کیا۔ چند سال کے بعد غازی الدین خاں نے بڑی چالاکی سے عالم گیر ثانی کو "کوٹلے فیروز شاہ" میں بلوایا اور اس کا سر تن سے جدا کر کے لاش دریائے جمنا کے کنارے ریت پر پھنکوا دی جہاں یہ لاش سارا دن بے گور و کفن پڑی رہی۔

حواشی:

1- سیر المتاخرین ص 42، مولفہ غلام حسین طباطبائی مطبوعہ کلکتہ۔

2- سیاسی و ثقافتی تاریخ مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین ص 84 نقوش "لاہور نمبر"۔

3- تحریکات ملی ص 27 (1707ء تا 1952ء) مولفہ سید ہاشمی فرید آبادی۔

4- تاریخ مرہٹہ ص 24 و ص 25 مولفہ مولوی ادریس خاں نجیب آبادی، نظر ثانی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

5- منتخب اللباب ص 389 حصہ دوم مولفہ خافی خاں، باہتمام ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ۔

6- تاریخ مرہٹہ ص 91 نظر ثانی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

7- تاریخ مرہٹہ ص 14، ص 15- بعض مورخوں نے زکریا خاں کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اس سازش میں شریک نہیں تھا۔ اس نے لاہور کو نادر شاہی لوٹ سے محفوظ رکھنے کے لئے نادر شاہ سے صلح کر لی تھی۔ (پیام)

8- تحریکات ملی ص 30، ص 34 (از 1707ء تا 1952ء) مولفہ سید ہاشمی فرید آبادی۔

9- تاریخ اودھ حصہ اول ص 81 مولفہ حکیم نجم الغنی خاں۔

10،11- مفتاح التواریخ ص 321 مولفہ طامس ولیم بیلی مطبع منشی نول کشور لکھنؤ۔

12- تاریخ مظفری ص 65 مولفہ محمد علی خاں (قلمی) مملوکہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

13- مفتاح التواریخ ص 319 مولفہ طامس ولیم بیلی (مطبوعہ 1867ء)

14- بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے محمد شاہ کی اطلاع کے بغیر خفیہ طور پر سید حسین علی کا کام تمام کروا دیا۔

15- منتخب اللباب ص 95، جلد نمبر 2 مولفہ خافی خاں۔

16- تاریخ مرہٹہ ص 101 نظر ثانی مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

17- سیر لمتاخرین ص 591 جلد دوم مولفہ غلام حسین طباطبائی مطبع نول کشور لکھنؤ۔

18- سیاسی و ثقافتی تاریخ' مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین' ص 90' ص 91 مطبوعہ نقوش "لاہور نمبر"۔

19- سیاسی و ثقافتی تاریخ' مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین ص 92' 93 مطبوعہ نقوش "لاہور نمبر"

20- تحریکات ملی ص 48' مولفہ سید ہاشمی فرید آبادی۔

21- سیاسی و ثقافتی تاریخ' مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین ص 105' نقوش لاہور نمبر۔

22- سیاسی و ثقافتی تاریخ' مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین ص 105' نقوش لاہور نمبر۔
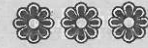
سکھ سرداروں کی مسلم دشمنی

1857ء کی بغاوت کے دوران صاحب فکر و نظر مسلمانوں نے انگریزوں کی حمایت کی تھی خصوصاً" پنجاب کے علماء اور ارباب فکرو نظر نے اس بغاوت کو مسلمانوں کے لئے تباہ کن قرار دیا تھا جس پر بعض کم فہم اور کوتاہ نظر لوگ معترض ہوتے ہیں۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ انگریزوں کی آمد سے قبل پنجاب کے مسلمانوں کو کس عذاب الیم سے گزرنا پڑا تھا اور سکھ سرداروں نے انہیں کس قدر ذلیل و خوار اور بے آبرو کیا تھا اس لئے جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے سکھ حکومت کا خاتمہ کیا تو مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا اور قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد انہیں امن و امان اور مذہبی آزادی نصیب ہوئی۔ یہ وجہ تھی کہ پنجاب کے تمام بڑے بڑے مسلمان روسا' امرا' نواب' علمائے دین اور دانشور 1857ء کی بغاوت میں انگریزوں کے وفادار رہے کیونکہ سکھ گردی کے ہولناک اور لرزہ خیز واقعات کھلی ہوئی کتاب کی طرح ان کے سامنے تھے۔ اب سکھ گردی کی تھوڑی سی تفصیل۔

بابا نانک" سکھ مذہب کے بانی نہیں تھے

سکھ مذہب کا بانی گرونانک صاحب" کو قرار دیا جاتا ہے حالانکہ بابا نانک" صاحب نے کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں ڈالی نہ اپنا کوئی الگ فرقہ قائم کیا۔ وہ ایک ہندو کے گھر پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد انہوں نے اسلامی لٹریچر سے واقفیت حاصل کی اور پھر مسلمان ہو کر اپنی زندگی انسانیت کی تبلیغ کے لئے وقف کردی۔ وہ ایک راست باز' شریف النفس اور خدا رسیدہ بزرگ تھے' انسان دوستی ان کا مسلک تھا' خوں ریزی اور فتنہ و فساد سے انہیں سخت نفرت تھی' امن و آشتی اور محبت و شفقت ان کا پیغام اور

نصب العین تھا۔ اسلام اور قرآن کریم سے انہیں اتنی محبت تھی کہ انہوں نے اپنے چوغے (چولے) پر قرآن شریف کی آیات لکھوائی تھیں۔ یہ چولہ آج بھی موجود ہے جس کا سکھ بے حد احترام کرتے ہیں اور اس کی زیارت کو بہت بڑی سعادت جانتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں بابا نانک" اسلام کے مبلغ تھے۔ وہ کسی نئے مذہب کے بانی نہیں تھے۔ خود غیر متعصب سکھ مورخوں کو بھی اعتراف ہے کہ بابا صاحب" نے کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں رکھی۔ چنانچہ ایک سکھ وِدوان لکھتے ہیں کہ:-

"گورو نانک جی کی تعلیم اور زندگی پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ آپ" کا مقصد کوئی اور دھرم کھڑا کرنا نہیں تھا ____ گورو نانک جی نے کوئی نیا مذہب جاری کرنے کی کوشش نہیں کی۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ (مختصر یہ کہ) گورو نانک صاحب نے کسی نئے مذہب کی بنیاد نہیں رکھی" (1)

گوبند سنگھ کی اسلام دشمنی

بعد کے گرو صاحبان نے اس مقدس بزرگ کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر "سکھ مذہب" بنا ڈالا۔ پھر اسے ایک سیاسی جماعت کی حیثیت دیدی گئی۔ گوبند سنگھ اس فرقے کے بانی تھے جنہوں نے اسلام دشمنی کو اپنا مسلک بنایا اور مسلمانوں کا غلبہ و اقتدار ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کرنے کی جدوجہد شروع کر دی۔ آنند پور کو اپنا مرکز مقرر کیا' متعدد قلعے تعمیر کروائے' جنگی ساز و سامان فراہم کیا اور اپنے پیروکاروں کو فوجی تربیت دلوا کر ایک منظم فوج تیار کی۔ (2)

گوبند سنگھ اسلام اور مسلمانوں کے کتنے بڑے دشمن تھے؟ اس کا اعتراف خود ایک سکھ فاضل نے کیا ہے جس نے اپنی انگریزی کتاب میں گوبند سنگھ کے عزائم کا ترجمہ کر کے دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ گوبند سنگھ کہتے ہیں کہ:

"MOHAMMADANS ARE MY ENEMIES. I HAVE LIFTED UP MY SWORD TO KILL THEM".(3)

(یعنی مسلمان میرے دشمن ہیں' میں نے انہیں قتل کرنے کے لئے اپنی تلوار کو بے نیام

کر لیا ہے)

ایسا نہیں کہ گوبند سنگھ کو مسلمانوں سے سیاسی وجوہ کی بنا پر دشمنی تھی بلکہ یہ شخص اسلام کا دشمن تھا' انبیائے کرام کا دشمن تھا' خدا کے نبیوں کی برملا ہتک کرتا اور ان کا مذاق اڑاتا تھا' چنانچہ کہتا ہے کہ:

جے جے غوث انبیا بھئے   "میں میں" کرتے جگ تے گئے
مہاں پورکھ کا ہوں نہ پچھانا   کرم دھرم کو کچھو نہ جانا (4)

یعنی جتنے اولیاء اور انبیاء دنیا میں آئے وہ سب مغرور اور متکبر تھے (اور "میں میں" کرتے تھے) ان میں سے کسی ایک کو بھی اللہ تعالٰی کی معرفت نصیب نہیں ہو سکی۔ یہ سب کرم دھرم کی پہچان سے بھی محروم رہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اس شخص کی گستاخی دیکھئے:

"مہاں دین تب پربھ اپراجا" (5)   عرب دیس کو کینو راجہ
تن بھی اپنا اک پنتھ اپراجا   لنگ بناں کیتے سب کاجا
سب تے اپنا نام جپائیو   ست نام کا ہوں نہ درڑائیو (6)

(یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ملک عرب میں پیدا ہوئے جنہوں نے اپنا ایک مذہب جاری کیا اور ختنے کی رسم ڈالی' لوگوں سے بس اپنا نام ہی جپوایا اور کبھی خدائے واحد کی عبادت کرنے کی تلقین نہیں کی) استغفر اللہ' استغفر اللہ۔

خود ایک سکھ مصنف نے اعتراف کیا ہے کہ ____ "ایک موقع پر گورو گوبند سنگھ نے محمدی مذہب کو دھوکے کی ٹٹی' حضور" اقدس اور آپ" کے خلفا کو جعل ساز اور احادیث حتیٰ کہ قرآن شریف کو جعل سازی کے کارنامے قرار دیا۔ مجلس میں مسلمان بھی موجود تھے وہ مشتعل ہو کر مرنے مارنے کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ سکھ مورخ بڑے فخر سے لکھتا ہے کہ "یہ دیکھ کر ہندوؤں اور سکھوں نے مل کر ان مشتعل مسلمانوں کے دانت کھٹے کر دیئے" (7)

اپنی فارسی تصنیف "ظفر نامہ" میں یہ گرو قرآن شریف کی اس طرح ہتک کرتا

ہے۔

کسے قول قرآں کند اعتبار   ہمہ روز آخر شود مرد خوار (8)

(یعنی جس شخص نے بھی قرآن شریف کے کسی قول کا اعتبار کیا آخر کار وہ ذلیل و خوار ہوا)

یہ کردار اور نظریات تھے سکھ مذہب کے "بانی" گوبند سنگھ کے۔ ایسے متعصب اور اسلام دشمن شخص سے کسی بھلائی کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پنجاب سے مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ کرنے کی غرض سے اپنی مسلح جدوجہد شروع کر دی مگر انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور مغل فوجوں نے انہیں پے درپے شکستیں دے کر اورنگ زیب عالم گیر سے معافی مانگنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد یہ گورو پنجاب کی سکونت ترک کر کے حیدر آباد دکن میں جا بسا اور وہیں 1708ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اپنے انتقال سے قبل گورو صاحب نے بندہ بیراگی نام کے ایک شخص کو جو بیراگی فرقے کا سربراہ تھا (سنسکرت زبان کا فاضل اور مذہبا" ہندو تھا) سکھ بنا کر اس کی تربیت کی اور مرنے سے قبل اسے اپنا جانشین مقرر کردیا۔ بندہ بیراگی جو بندہ سنگھ کے نام سے معروف ہوا پنجاب آیا اور اپنے گرو کی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے اور مسلمانوں کو بزعم خود نیست و نابود کرنے کی سفاکانہ جدوجہد شروع کر دی جس کے لئے حالات پوری طرح سازگار تھے' اس کی تھوڑی سی تفصیل۔

دہلی کی مرکزی حکومت کی نااہلی اور پنجاب کے صوبیداروں کی جنگ اقتدار نے سب سے زیادہ نقصان ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں کو پہنچایا۔ بہادر شاہ اول (ابن اورنگ زیب) کے بھائیوں اور پھر بہادر شاہ کے بیٹوں کی خانہ جنگی نے ان علاقوں کا امن وامان ہی غارت نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کا رعب بھی ختم ہو گیا۔ یہی دور تھا جب پنجاب میں بندہ سنگھ نے سر اٹھایا جسے گورو گوبند سنگھ نے اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور پنجاب جا کر امن دشمن سرگرمیاں شروع کرنے کی ہدایت کی تھی۔ بہادر شاہ اول اور فرخ سیر کے زمانے میں نواب عبدالصمد خاں اور محمد امین خاں جیسے بہادر افغان جرنیل نے گرو گوبند سنگھ کے اس جانشین یعنی بندہ سنگھ کا زور توڑ دیا۔ اسے شکست دے کر گرفتار کر لیا گیا اور

دہلی لے جا کر عبرتناک طریقے سے ہلاک کر دیا گیا۔ نواب عبدالصمد خاں کے بعد سکھوں نے پھر سر اٹھایا۔ ان کے بیٹے نواب زکریا خاں اور پنجاب کے آخری بہادر اور مدبر گورنر میر معین الملک عرف میر منو نے ان کی سرکوبی کی اور مولی گاجر کی طرح کاٹ کر پھینک دیا۔ میر منو سے پہلے احمد شاہ ابدالی نے بھی بار بار ان پر حملے کئے اور شکستوں پر شکستیں دے کر انہیں جنگلوں میں روپوش ہونے پر مجبور کر دیا اور ان سے زر کثیر بطور تاوان وصول کیا۔(9)

احمد شاہ ابدالی کے جاتے ہی سکھ پھر نکل آتے اور پنجاب بھر میں قتل و غارت شروع کر دیتے۔ جب میر منو کا انتقال ہو گیا تو پنجاب لاوارث ہو گیا۔ اس کی بیوی مغلانی بیگم اپنے خورد سال بیٹے کے نام پر پنجاب کی حکمران بن گئی۔ مگر جلد ہی نواب عبداللہ اور مغلانی بیگم کے درمیان پنجاب کی حکومت حاصل کرنے کے لئے اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی۔ نواب عبداللہ نے مغلانی بیگم کو قید کر دیا اور جولائی 1755ء میں لاہور پر اس کا قبضہ ہو گیا۔ اس شخص نے حصول زر کی خاطر لاہور کے شہریوں کو بری طرح لوٹا۔ معلوم نہیں کتنے لوگ اس کے فوجیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ لوٹ مار سے امراء تو امراء غرباء بھی محفوظ نہ رہے اور لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ نواب عبداللہ کے عہد حکومت کی بد نظمی اور لوٹ مار نے اس ضرب المثل کو جنم دیا۔

"حکومت نواب عبداللہ - نہ رئی چکی نہ رئیا چلھا" (10)

یعنی نواب عبداللہ کی حکومت ایسی منحوس تھی اور اس میں ایسی لوٹ مار ہوئی کہ گھروں میں چکی اور چولہے تک باقی نہ رہے۔ اسی دوران فتنہ پرداز آدینہ بیگ نے جو دوآبہ جالندھر کا حاکم بن بیٹھا تھا لاہور پر حملہ کیا اور شہر پر قبضہ کر لیا۔ آدینہ بیگ' مغلانی بیگم اور نواب عبداللہ خاں کی کشمکش اقتدار نے پنجاب کو جنگ و جدل کا اکھاڑا بنا دیا۔ یہ صورت حال سکھوں کے لئے بڑی حوصلہ افزا ثابت ہوئی اور وہ پھر اپنی کمیں گاہوں سے نکل آئے۔ 1761ء سے لے کر 1765ء تک لاہور اور اس کے نواحی علاقے سکھوں کی تباہ کاریوں کا بار بار نشانہ بنے۔ کئی بار انہوں نے لاہور پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس کے بعد ان کی طاقت کو توڑا نہ جا سکا۔ ان کے مختلف جتھے پنجاب کے مختلف علاقوں کے حاکم بن

بیٹھے۔ آخر کار رنجیت سنگھ سکھ اقتدار کو باقاعدہ اور مستقل حکومت کی شکل دینے میں کامیاب ہو گیا۔

لاہور کے بعض مسلمانوں کی غداری

یہ کارنامہ بھی ایک مسلمان ہی کے ہاتھوں انجام پایا یعنی احمد شاہ ابدالی کا پوتا زمان شاہ' جس نے لاہور کا پروانہ حکومت رنجیت سنگھ کو عطا کر دیا۔ رنجیت سنگھ یہ پروانہ لے کر لاہور آیا اور شہر پر قابض ہو گیا۔ اسی دوران قصور کا افغان حاکم نظام الدین خاں لاہور پر قبضہ کرنے کی جدوجہد کر رہا تھا۔

لاہور پر رنجیت سنگھ کے قبضے سے قبل یہاں تین سکھ سرداروں کی حکومت تھی 'گوجر سنگھ' سوبھا سنگھ' لہنا سنگھ۔ تاریخ انہیں "سہ حاکمان لاہور" کے نام سے یاد کرتی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں نے لاہور کی حکومت سنبھالی اور پھر اسے تین حصوں میں تقسیم کر لیا۔ ان نئے "سہ حاکمان لاہور" کے نام تھے صاحب سنگھ' چیت سنگھ اور مہر سنگھ۔ یہ سکھ سردار ایک طرف تو آپس میں برسرپیکار رہتے تھے اور دوسری طرف لاہور کے شہری ان کے ہاتھوں عذاب الیم میں گرفتار تھے۔ خود سکھ مورخ اعتراف کرتے ہیں کہ "بھنگی سرداروں نے لاہور کو تین حصوں میں تقسیم کر لیا جس کی وجہ سے خود ان میں جنگ و جدل رہتی تھی۔ عوام کی جان مصیبت میں مبتلا تھی' لوگ لوٹے جاتے تھے' مارے جاتے تھے' کوئی فریاد سننے والا نہ تھا' کوئی انصاف نہیں تھا۔ لوگوں کو کسی جرم کے بغیر پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جاتا تھا۔(11)

لاہور کے ممتاز مورخ پروفیسر شجاع الدین لکھتے ہیں کہ "نظام الدین خاں نے لاہور کے مسلمانوں سے رابطہ قائم کر کے شہر پر قبضہ کرنا چاہا تاکہ مسلمان سکھوں کے انسانیت سوز مظالم سے نجات پا جائیں۔ اس وقت اسلامیان پنجاب میں یہ شخص بہت اہم تھا اور اس تگ و دو میں تھا کہ پنجاب میں پھر سے اسلامی حکومت قائم ہو جائے.... اگر اس محب ملت' خان کی مساعی بار آور ہو جاتیں تو 1799ء ہی میں (یعنی آج سے دو سو سال قبل ہی) "مغربی پاکستان" کا اسلامی صوبہ معرض وجود میں آ جاتا اور رنجیت سنگھ کو

کبھی لاہور کا راجہ بننے کا موقع نہ ملتا"۔(12) مگر خود مسلمانوں ہی نے قصور کے خان کا یہ منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ رنجیت سنگھ نے دو بااثر مسلمانوں کی خدمات حاصل کیں۔ چنانچہ قاضی خاں اور قاضی عبدالرحمٰن رام نگری خفیہ مشن پر لاہور آئے اور انہوں نے یہاں کے سرکردہ افراد سے ملاقات کی۔ میاں محمد عاشق' میاں جان محمد' مہر محکم دین' اٹاری کا عابد خاں' محمد عظیم' باغبان پورہ کا حافظ محمد' مہر شادی قطار بند' احمد خاں بھنڈر' محمد باقر' محمد طاہر' مولوی محمد سلیم اور مفتی مکرم نے رنجیت سنگھ کے فرستادوں سے سازباز کی۔ (13) ایک عرضداشت تیار ہوئی جس پر لاہور کے ان مولویوں' مفتیوں اور چوہدریوں نے دستخط کئے اور رنجیت سنگھ کی وفاداری کا عہد کیا"۔ رائے بہادر کنھیالال کے بیان سے بھی اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے کہ لاہور کے مسلمانوں نے رنجیت سنگھ کو شہر پر قبضہ کرنے کی دعوت دی اور موضع نواں کوٹ کے رئیس مہر محکم دین نے لوہاری دروازہ کھلوا کر رنجیت سنگھ کی فوجوں کو شہر میں داخل کروا دیا۔(14) اس خدمت کے صلے میں رنجیت سنگھ نے مہر محکم دین کو "بابا" کا خطاب دیا۔

اس طرح لاہور کے بعض مسلمانوں کی سازش اور غداری سے 6 جولائی 1799ء کو لاہور پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کی حکومت کو استقلال نصیب ہو گیا۔ اب اس نے آگے قدم بڑھایا اور رفتہ رفتہ ملتان تک سارے پنجاب پر قبضہ کر لیا ورنہ اس کا یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔

پنجاب کے بعد رنجیت سنگھ نے صوبہ سرحد کی طرف توجہ کی۔ یہ مہم بھی بعض افغان سرداروں کی حمایت سے مکمل ہو گئی ورنہ صوبہ سرحد کے افغانوں کو مغلوب کرنا رنجیت سنگھ کے بس کا روگ نہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب احمد شاہ ابدالی کی قائم کی ہوئی حکومت اس کے نااہل جانشینوں کے ہاتھوں ضعف اور انحطاط کا شکار تھی۔ پشاور اور کشمیر کے افغان گورنر' شاہ محمود خاں (حاکم افغانستان) سے باغی ہو رہے تھے۔ جہاں داد خاں گورنر اٹک کو محمود خاں سے خطرہ پیدا ہوا کہ وہ اسے معزول نہ کر دے چنانچہ اس نے رنجیت سنگھ سے رابطہ قائم کیا اور اسے اپنی امداد کے لئے بلایا۔ رنجیت سنگھ نے امداد کی یہ شرط پیش کی کہ جہان داد خاں اٹک پر سکھوں کا قبضہ کروا کر اس سے دست بردار

ہو جائے۔ اٹک کی بجائے وزیر آباد کا شہر جہان داد خاں کو مستقل ملکیت کے طور پر دیدیا جائے گا اور ایک لاکھ روپیہ نقد عطا کیا جائے گا۔ غدار اور خود غرض جہاں داد خاں نے یہ سودا منظور کر لیا اور رنجیت سنگھ کی فوجیں اٹک میں داخل ہو کر اس شہر پر قابض ہو گئیں۔ اسی طرح ہزارہ کے سردار ہاشم خاں نے اپنے حریف محمد خاں ترین سے انتقام لینے کے لئے راولپنڈی جا کر وہاں کے سکھ گورنر سردار مکھن سنگھ سے امداد کی درخواست کی۔ (15) چنانچہ مکھن سنگھ اس کی امداد کے لئے سکھ فوج لے کر روانہ ہو گیا اور پھر سارے ہزارہ پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ رفتہ رفتہ کشمیر بھی رنجیت سنگھ کی حکومت میں شامل ہو گیا۔ مسلمانوں کو اس غداری کی جو سزا ملی اس کی داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے خدا مسلمانوں سے ہمیشہ کے لئے ناراض ہو گیا ہے اور زمین نے انہیں پناہ دینے سے دائمی طور پر انکار کر دیا ہے۔ رنجیت سنگھ بلکہ اس کے پیش رو سکھ سرداروں نے پنجاب کے مسلمانوں پر جو انسانیت سوز مظالم کئے ان کا خود سکھ مورخوں' مصنفوں اور اخبار نویسوں نے اعتراف کیا ہے جنہیں پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں ان واقعات کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔

بندہ سنگھ کے مظالم

مشہور سکھ مورخ گیانی گیان سنگھ لکھتے ہیں کہ (بندہ بہادر نے) "سامانہ" پر حملہ کر کے اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور بے شمار مسلمان عورتوں' بچوں اور جوانوں کو قتل کر ڈالا یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چیر کر ان کے بچے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور بے شمار عورتوں کی عصمت دری کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ (16)

بندہ سنگھ نے سرہند پر حملہ کر کے جس طرح تباہی مچائی ایک سکھ مورخ اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اس قتل و غارت میں پانچ ہزار آدمی (مرد) اور اتنی ہی عورتیں اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ بڑے بڑے معزز گھرانوں کی عورتوں نے جب کسی طرح بھی اپنا بچاؤ نہ دیکھا تو مکانوں سے گر کر اور کنوؤں

میں کود کر اپنی زندگیاں ختم کر دیں اور اپنی عصمت کی سفید چادر پر داغ نہ لگنے دیا۔ آنکھ جھپکنے میں تمام شہر لاشوں سے بھر گیا اور ایسا گرا کہ آج تک اس کی حالت ایسی نہ ہو سکی"۔ (17)

یہی سکھ مورخ سہارنپور پر سکھوں کی یلغار کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے " شہر دل کھول کر لوٹا گیا۔ مکان جلائے گئے اور قتل عام کیا گیا ایسا کہ کئی سال تک یہ شہر ہوش نہ سنبھال سکا ___ (سکھوں کو) سہارن پور سے اس لئے عداوت تھی کہ یہ اسلام کے پابند مسلمانوں کا شہر تھا"۔ (18) نانوتہ (ضلع سہارن پور) میں شیخ محمد افضل صاحب کی حویلی کے صحن میں سکھوں نے تین سو شیخ زادے بیک وقت موت کے گھاٹ اتار دیئے تھے"۔ (19)

ایک اور سکھ مورخ سکھوں کے مظالم کی داستان بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "سکھوں نے حملہ کیا تو نمازیں پڑھتے' وضو کرتے بلکہ پیشاب اور پاخانہ کے لئے بیٹھے مسلمانوں کو ازار بند باندھنے کی بھی مہلت نہ ملی اور سکھوں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ حشر برپا دیکھ کر لوگ توبہ توبہ پکار اٹھے"۔ (20)

بندہ سنگھ کے بعد سکھوں کی درندگی

بندہ سنگھ ظلم و ستم اور سفاکی کا جو راستہ دکھا گیا تھا اور سنگ دلی کے جو مظاہرے کر گیا تھا اس کے جانشینوں نے بھی وہی راستہ اختیار کیا بلکہ سفاکی میں اس سے بھی آگے بڑھ گئے چنانچہ ایک سکھ مورخ لکھتا ہے کہ "سرہند کے حاکم باز سنگھ نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ جب بھی وہ گھوڑے پر سوار ہوتا تو ایک مسلمان کے سر پر اپنا قدم رکھ کر رکاب میں پاؤں ڈالتا تھا۔ اس کے لئے ہر مرتبہ ایک مسلمان کا سر قلم کرنا پڑتا"۔ (21)

مسلمان شریف زادیوں کا حشر

بڈھاگ سنگھ نامی سکھ پیشوا نے ناصر علی کی لاش قبر سے نکال کر اس کے منہ میں سور کا گوشت ٹھونس دیا تھا اور پھر اسے جلا دیا تھا نیز اس نے یہ بھی حکم

دیا کہ اس کے (یعنی بڈھاگ سنگھ کے) جتنے بھی پیروکار ہیں وہ سب جالندھر کی ایک ایک عورت اپنے گھروں میں ڈال لیں ____ ان کے اس حکم پر خالصہ دل کے بھنگیوں اور چوہڑوں تک نے (جالندھر کے) معزز خاندانوں کی عورتیں اپنے گھروں میں ڈال لی تھیں۔ یہ بیان کسی مسلمان یا انگریز مورخ کا نہیں بلکہ ایک سکھ مورخ کا اعتراف ہے۔ (22)

مسلمان تو مسلمان اگر کوئی ہندو، سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی حمایت یا امداد کرتا تو سکھ اس پر بھی وہ ظلم توڑتے کہ انسانیت شرم سے آنکھیں جھکا لیتی بلکہ سر پیٹ لیتی (سکھوں نے) "سچانند (جو مسلمانوں کا حامی و مددگار تھا) کے بیٹے کو پکڑ لیا اور ان کی مستورات کو صرف ایک کپڑا سر ڈھانپنے کے لئے دے کر الف ننگیوں کو شہر کے ہر گھر سے بھیک مانگنے پر مجبور کیا گیا اور ڈونڈی (ڈھنڈورا) پٹوا دی گئی کہ کوئی شخص ایک کوڑی کے بغیر انہیں کچھ نہ دے۔ اس طرح جب وہ سارے شہر سے بھیک مانگ چکیں تو انہیں عذاب دے کر قتل کر دیا گیا"۔(23)

سکھ فرقہ مسلمانوں کے عہد حکومت میں قائم ہوا اور انہی کے عہد حکومت میں پھیلا اور بڑھا۔ ایک سے لاکھوں ہو گئے مگر کسی مسلمان بادشاہ یا اَمیر نے سکھوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو روکنے یا انہیں اپنا مذہب ترک کرنے پر مجبور نہیں کیا کیونکہ مسلمانوں کا دین ہر ایک کو تبدیلی مذہب کی مکمل آزادی دیتا ہے مگر سکھوں نے اپنے مختصر سے عہد اقتدار میں معلوم نہیں کتنے ہزار مسلمانوں کو سکھ مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ چنانچہ ایک سکھ مورخ اعتراف کرتا ہے کہ "مسلمانوں کو زبردستی سکھ بنایا گیا" (24) ایک اور سکھ مورخ لکھتا ہے کہ "سردار پنجاب سنگھ کے فرقے سے تعلق رکھنے والے بھائی روزہ سنگھ نے اپنے ساتھ دو سو کے قریب سکھ شامل کر کے کشمیر اور پوٹھوہار میں بے شمار لوگوں کو جبراً "سکھ بنایا"۔(25)

رنجیت سنگھ کی مسلم دشمنی

کہا جاتا ہے کہ سکھوں میں رنجیت سنگھ واحد حکمران تھا جس نے باقاعدہ حکومت قائم کی اور عدالتی نظام اور قوانین ترتیب دیئے مگر اس عدالتی نظام اور قوانین

سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا وہ بدستور ظلم و ستم کی چکی میں پستے رہے اور شعائر اسلام کی توہین ہوتی رہی۔ بقول مولانا غلام رسول مہر رنجیت سنگھ سے قبل جو مظالم بے ترتیبی اور بد نظمی سے ہوتے تھے رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں ان مظالم نے منظم شکل اختیار کر لی تھی۔ رنجیت سنگھ کے عدالتی نظام کی تصویر خود ایک سکھ مورخ نے کھینچی ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ سکھ مورخ لکھتا ہے کہ ____ "رنجیت سنگھ اپنی مرضی کے مطابق حکومت کرتا تھا اور حکومت کا تمام کاروبار، اسی کے ہاتھ میں تھا--- عدالتوں کی رہنمائی کے لئے قوانین کا کوئی ضابطہ سرے سے موجود ہی نہ تھا"۔(26)

رنجیت سنگھ نے سارے پنجاب اور کشمیر میں کشت و خوں ریزی کا بازار گرم کر دیا۔ چنانچہ ایک سکھ مورخ کے بیان کے مطابق رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں " شریف عورتیں جنھوں نے ڈیوڑھی سے باہر قدم نہ رکھا تھا اپنی عصمت اور عزت کے خوف سے خود پھانسی لے کر مر گئیں یا کنوؤں میں ڈوب مریں۔ سکھوں نے بہت سی جوان اور خوبصورت عورتیں، لڑکیاں حتیٰ کہ خوبصورت لڑکے گرفتار کر لئے۔ شہر کو لوٹ کر محتاج کر دیا"۔(27)

رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا جو حشر ہوا اور ان کی مذہبی آزادی جس طرح سلب کی گئی اس کا اعتراف سکھ مورخوں کو بھی ہے۔ چنانچہ ایک سکھ مورخ لکھتا ہے کہ (رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں) بے شمار مساجد گرا دی گئیں اور پورے علاقے میں اذان دینے کی ممانعت کر دی گئی۔ مساجد میں سور مارے گئے"۔(28)

خود رنجیت سنگھ نے جس طرح مساجد کی بے حرمتی کی اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیے۔ لاہور کے محلے "ڈبی بازار" میں ایک مسجد مغلوں کے زمانے میں تعمیر کی گئی تھی۔ یہ قاضی کی مسجد کے نام سے موسوم تھی۔ اس کا راجہ رنجیت سنگھ نے کیا حشر کیا اس کی روداد ایک سکھ مورخ کی زبان سے سنئے:

"گوردوارہ باؤلی صاحب" کی تعمیر کا حال بھی قابل مطالعہ ہے۔ جس جگہ اب " گوردوارہ باؤلی صاحب" بنی ہوئی ہے یہاں دراصل ایک قاضی نے مسجد تعمیر کروائی تھی

مہاراجہ جی کے حکم سے وہ مسجد گرادی گئی۔ (29) (اس کی جگہ یہ گوردوارہ تعمیر کیا گیا)۔

آگے چلئے۔ لاہور کی سنہری مسجد کے ساتھ رنجیت سنگھ کے عہد حکومت میں کیا ماجرا گزرا؟ ایک سکھ مورخ بیان کرتا ہے کہ:

"مہاراجہ نے ملاں کو حکماً" مسجد سے نکلوا دیا۔ وہاں گوبر کا لیپ کروا دیا اور "گرنتھ صاحب" رکھوا دیا۔ مسلمان رعایا اس پر سخت ناراض ہوئی۔ سب مل کر رنجیت سنگھ کے وزیر دربار فقیر عزیزالدین کے پاس گئے۔ انہوں نے کلو ماشکی کو جو مہاراجہ صاحب کا بہت منہ لگا ہوا تھا اپنے ساتھ شامل کیا اور بہت منت سماجت کر کے مسجد اس شرط سے مسلمانوں کو واپس دلوائی کہ وہ اس میں بلند آواز سے اذان نہیں دیا کریں گے۔ (30) (تاکہ اردگرد آباد سکھوں اور ہندوؤں کا دھرم بھرشٹ نہ ہو جائے۔ مولف)

مسجد وزیر خاں کی بے حرمتی

اور سنئے اور دونوں ہاتھوں سے سر پیٹئے!

"رنجیت سنگھ ایک روز موراں طوائف کو لے کر وزیر خاں کی مسجد کے مینار پر شراب نوشی اور بدکاری کرتا رہا"۔ (31)

یعنی سارے شہر میں صرف ایک ہی جگہ رہ گئی تھی' مسجد وزیر خاں ____ جسے اس مسلم دشمن بلکہ اسلام دشمن سکھ راجہ نے شراب نوشی اور بدکاری کے لئے منتخب کیا۔ استغفراللہ' استغفراللہ' استغفراللہ۔ خانہ خدا کی بے حرمتی کی اس سے زیادہ بدترین مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

27 جون 1839ء کو رنجیت سنگھ فالج میں مبتلا ہو کر فوت ہو گیا۔ آخر میں زبان بھی بند ہو گئی تھی۔ اس کا بیٹا کھڑک سنگھ راجہ ہوا مگر اس کے بیٹے نونہال سنگھ نے باپ کو رسیوں سے جکڑ کر قید کر دیا اور خود راجہ بن بیٹھا۔ سکھ مورخوں کے بقول راجہ نونہال سنگھ کو جب وہ باپ کی ارتھی جلا کر واپس آ رہا تھا ایک سازش کے تحت شاہی قلعے کے دروازے میں ہلاک کروا دیا گیا۔ (32) نونہال سنگھ کے بعد رنجیت سنگھ کا بیٹا شیر سنگھ راجہ ہوا۔ یہ اپنے باپ سے بھی زیادہ ظالم' بدکردار اور عیاش تھا۔ ہزاروں بے گناہ افراد

کو پھانسیاں دیں اور ان کے ہاتھ پیر کٹوا دیئے۔ اپنی بھاوج کو قتل کروا دیا۔ اس کی بہت سی خادماؤں کے ہاتھ' پیر' ناک' کان کٹوا کر انہیں تہہ تیغ کروا دیا۔ 15 ستمبر 1843ء کو لاہور میں چاہ میراں کے قریب ایک سکھ سردار اجیت سنگھ سندھاوالئے نے اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا اس کے ساتھ ہی اس کے سات سالہ بیٹے کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اس کے بعد پنجاب میں جو بدنظمی اور ابتری پھیلی اس کی نظیر برصغیر کی ہزاروں سالہ تاریخ میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔ ایک سکھ مورخ لکھتا ہے کہ "مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دس بارہ سال بعد کی تاریخ پھوٹ' خانہ جنگی' سازشوں' غداریوں' تباہیوں اور بربادی کی دردناک کہانی ہے جو رونگٹے کھڑے کر دیتی ہے اور آنکھوں میں خون کے آنسو لے آتی ہے"۔ (33)

اب آخر میں ایک راست باز اور حق گو سکھ دانشور سردار سنتوکھ سنگھ کا بیان ملاحظہ ہو جو اعتراف کرتا ہے کہ ماضی کے سکھ سرداروں اور حکمرانوں کا طرز عمل سخت ظالمانہ اور سفاکانہ تھا چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ:

"سکھ دنگا باز اور لٹیرے تھے انہوں نے گورو جی سے دنگا فساد ہی طلب کیا تھا۔ سکھوں نے مسلمانوں کے بچے قتل کئے۔ ان کی بہو بیٹیوں کو جبراً" پکڑا اور سور مار مار کر کھلائے اور امرت پلا کر ان سے (جبراً) شادیاں کیں۔ ایک مکان میں متعدد مسلمان بند کر دیئے اور تیسرے دن دروازہ کھولنے پر آدھے مرے ہوئے تھے' ایک کو زندہ جلا دیا ایک اور کو نیزے پر لٹکا دیا' مساجد گرا دیں ان میں سور مارے' نماز اور اذان بند کر دی"۔ (34)

سکھوں کے ظلم و ستم سے تاریخ کے صفحات سرخ ہو رہے ہیں۔ یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ ایک معمولی سا فرقہ اس قدر طاقت کیسے پکڑ گیا کہ وہ ہندوستان کے سرفروش اور بہادر مسلمانوں سے آباد تین صوبوں (پنجاب' سرحد اور کشمیر) پر مسلط ہو گیا۔ پھر اس نے وہ ظلم کئے کہ ان بہادر مسلمانوں کی جراتیں اور ہمتیں پست ہو گئیں اور وہ ان کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ یہ صورت حال خود مسلمانوں نے پیدا کی ان کے امراء اور

سرداروں کی نااتفاقی و خود غرضی اور خانہ جنگی نے سکھوں کو دلیر کیا اور وہ ان پر اس طرح مسلط ہوئے کہ قریباً ڈیڑھ سو سال تک ان کے ہاتھوں مسلمانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال غارت ہوتے رہے۔ آپ دیکھ چکے ہیں' خود سکھ مورخ اعتراف کر رہے ہیں کہ سکھوں کے دور حکومت میں پنجاب کے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا تھا' ان کی زندگی اجیرن کر دی گئی تھی' ان کی جان' مال' عزت' آبرو' مذہب غرض یہ کہ ہر چیز تباہ کی جا رہی تھی' کوئی ان کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ سارا پنجاب بدامنی' انتشار' لوٹ مار اور قتل و غارت گری کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ سکھ فوجیں خود سر تھیں اور سارے پنجاب کو تہہ و بالا کر رہی تھیں۔ یہی حال ہندوستان کے باقی صوبوں کا تھا' پنجاب میں سکھوں اور دوسرے صوبوں میں مرہٹوں اور ہندو جاٹوں نے ملک کا امن و اماں غارت کر رکھا تھا۔

پنجاب میں مسلمانوں بلکہ انسانیت کی یہ غارت گری اس وقت ختم ہوئی جب انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر ان کی حکومت کا خاتمہ کیا اور مسلمانوں کو اس عذاب الیم سے نجات دلائی' ان کی مساجد واگذار کروائیں' ان کی عزت و آبرو کو تحفظ دیا' انہیں مذہبی آزادی عطا کی اور ہر طرف امن و اماں کی شہنائیاں بجنے لگیں۔ یہ تاریخ کی وہ حقیقت ہے جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

ان حالات میں اگر پنجاب کے مسلمان روسا' علما اور دانشوروں نے انگریزوں سے تعاون کیا اور 1857ء کے ہنگامے میں ان کی امداد کی تو کون سا گناہ کیا۔ سرسید اور ان کے معاصرین پر زبان طعن دراز کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ان غیرت دار لوگوں نے کن حالات اور کس پس منظر میں انگریزوں کی حمایت کی تھی۔ اگر وہ انگریزوں کی حمایت نہ کرتے تو کیا اس خطہ ارض کو پھر طوائف الملوکی کے سپرد کر دیتے اور سکھ پھر ان کی مساجد کو اصطبل بناتے' ان کے دینی مدرسوں کو تباہ کرتے' ان کی عورتوں کی عصمت دری کرتے' ان کے شہروں کو ویران کرتے' ان کے علماء کو قتل کرتے اور یہی حشر مرہٹوں' ہندو جاٹوں اور "پوربے" ہندوؤں کے ہاتھوں ہندوستان کے باقی صوبوں کے مسلمانوں کا ہوتا۔ خدا کے لئے انصاف کیجئے اور ان حالات کو نظرانداز نہ کیجئے جن میں اس دور کے مسلمان اکابر نے انگریزوں کی حمایت کی تھی۔ وہ بے غیرت نہیں تھے' قوم

کے لئے غیرت اور درد رکھتے تھے۔

موجودہ سکھ ماضی کے واقعات کے ذمہ دار نہیں!

یہاں ایک بات کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ ماضی کے سکھ سرداروں اور سکھ حکمرانوں نے مسلمانوں پر جو ظلم و ستم کئے اس کے وہ ذمہ دار تھے' موجودہ سکھ قوم اس کی ذمہ دار نہیں۔ یہ بات سخت بددیانتی' بے ایمانی اور ناانصافی کی ہے کہ باپ کا گناہ بیٹے کے کھاتے میں اور دادا کا گناہ پوتے کے حساب میں درج کر دیا جائے۔ آج کی سکھ قوم ایک شریف' متمدن' شائستہ اور امن پسند قوم ہے اور مسلمانوں کے ساتھ تو اس کا رویہ بہت ہی ہمدردانہ اور انسان دوستی کا ہے۔

حواشی:

1- (رسالہ "سنت سپاہی" امرتسر نومبر 1962ء)
2- (رسالہ گورمت پرکاش امرتسر شمارہ فروری 1965ء)
3- (SAKHEEBOOKPAGE.85)
4- دسم گرنتھ ص 50-
5- خود سکھ مصنفوں نے لکھا ہے کہ "مہاں دین تب پربھ اپراجا" سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مبارک ذات اور دین اسلام مراد ہے۔
("مہان کوش" ص 700) و ("گورمت سدھا" ص 51 "دھرم دا چھتر" ص 18)
6- دسم گرنتھ ص 51-
7- گوروپد پرکاش ص 112-
8- بحوالہ دسم گرنتھ۔
9- تاریخ پنجاب ص 85' مولفہ رائے بہادر کنہیالال۔
10- ثقافتی و سیاسی تاریخ ص 102' مولفہ پروفیسر محمد شجاع الدین۔
11- "شیر پنجاب" ص 16' ص 24 بحوالہ "تصویر کا دوسرا رخ"۔
12- سیاسی و ثقافتی تاریخ ص 113 مولفہ پروفیسر شجاع الدین

-13 سیاسی وثقافتی تاریخ ص 114

-14 تاریخ پنجاب ص 140' مولفہ رائے بہادر کنہیا لال

-15 ہزارہ گزیٹئر ص 689-

-16 پنتھ پرکاش ص 259 مولفہ گیانی گیان سنگھ بحوالہ "تصویر کا دوسرا رخ"

-17 سکھاں راج کویں لیا (یعنی سکھوں نے حکومت کس طرح حاصل کی) ص 164 مولفہ سردار کرم سنگھ۔

18 '19- دی اتہاسک کھوج (یعنی تاریخ کا سراغ) ص 104 - 105 مولفہ سردار کرم سنگھ

-20 سکھاں راج کویں لیا ص 43-

-21 دی اتہاسک کھوج ص 87' مولفہ سردار کرم سنگھ۔

-22 دی اتہاسک کھوج ص 94 مولفہ سردار کرم سنگھ۔

-23 جیون برتانت بابا بندہ بہادر ص 75 مولفہ سردار کرم سنگھ

-24 اتہاسک کھوج ص 81 مولفہ سردار کرم سنگھ۔

-25 پنتھ پرکاش ص 868-

-26 گولڈن ٹمپل ہندو اتہاس ص 231-

-27 تواریخ گورو خالصہ اردو ص 90 حصہ سوم۔

-28 دی اتہاسک کھوج ص 93 مولفہ سردار کرم سنگھ

-29 سکھ راج ص 129-

-30 حیات رنجیت سنگھ ص 35 مطبوعہ 1905-

-31 حیات رنجیت سنگھ ص 28-

-32 مہان کوش ص 541 سکھ اتہاس حصہ اول ص 164 سکھ راج ص 60

-33 سکھ اتہاس لیکچر ص 373

-34 "جیون پریتی" ص 6' جون 1975ء چندی گڑھ (بھارت)

ضروری وضاحت:

سکھوں سے متعلق باب میں جن سکھ مورخوں کی گورمکھی کتابوں کے حوالے دیئے گئے ہیں یہ سب گورمکھی زبان کے فاضل جناب عباداللہ گیانی کی کتاب "تصویر کا دوسرا رخ" سے ماخوذ ہیں۔ راقم الحروف گورمکھی زبان سے نابلد ہے اس لئے وہ اس زبان کی کتابوں سے استفادہ نہیں کرسکتا۔ (پیام)

فرنگی تسلط کے اسباب

انگریز ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ اصولاً'' قانوناً'' اور اخلاقاً'' انہیں اپنی سرگرمیاں صرف اور صرف تجارت تک محدود رکھنی چاہئے تھیں۔ انہیں ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مداخلت کرنے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ انگریزوں کا یہ اقدام غلط اور خلاف اصول تھا۔ دنیا کا کوئی منصف مزاج مورخ ان کی ہوس ملک گیری کی حمایت یا تعریف نہیں کر سکتا۔ تاریخ کی یہ ایسی حقیقت ہے کہ انگریزوں کا بڑے سے بڑا حامی بھی جس کا انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ انگریز ہندوستان کی سیاست میں خود بخود داخل نہیں ہوئے بلکہ انہیں داخل کیا گیا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انگریزوں کے غلبہ و تسلط میں جتنا دخل انگریزوں کا ہے اس سے زیادہ خود اہل وطن کا۔ آیئے تاریخ کے ان حقائق کا اختصار سے جائزہ لیں۔

1600ء کا واقعہ ہے کہ انگلستان کے چند بڑے تاجروں نے اپنی حکومت سے ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے کی اجازت مانگی تاکہ اس کمپنی کے ذریعے انگلستان اور ہندوستان میں تجارتی روابط قائم ہو جائیں اور کمپنی کو مالی منفعت حاصل ہو۔ حکومت برطانیہ نے اجازت دیدی۔ اس تجارتی کمپنی کا نام "ایسٹ انڈیا کمپنی" رکھا گیا۔ اس واقعے کے 8 سال بعد ایک تجارتی جہاز ہندوستان پہنچا۔ کپتان ہاکنز اس کا انچارج تھا۔ جہاز سورت میں لنگرانداز ہوا۔ یہ 1608ء کا واقعہ ہے۔ اس زمانے میں نورالدین جہانگیر ہندوستان کا بادشاہ تھا۔ کپتان ہاکنز جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہوا اور سورت میں تجارتی کمپنی قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے اجازت دیدی۔ (1)

1613ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے سورت میں اپنی پہلی کوٹھی تعمیر کی۔ اس طرح پہلی بار انگریزوں کو ہندوستان میں اپنے قدم جمانے کا موقع ملا۔ اس واقعے کے دو سال بعد یعنی 1615ء میں برطانوی سفیر ٹامس رو ہندوستان آیا اور شہنشاہ جہانگیر کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی قابلیت اور خوش گفتاری سے انگریز تاجروں کے لئے بعض تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ بمبئی پہلے ہی بادشاہ انگلستان کی ملکیت تھا۔ 1668ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بادشاہ انگلستان کی اجازت سے بمبئی کو بھی اپنا تجارتی مرکز بنا لیا۔ 1690ء میں دریائے ہگلی کے مشرقی جانب ایک جوہڑ کے قریب ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک بستی بسائی۔ اس کے لئے بھی کمپنی کے افسروں نے جہانگیر سے اجازت حاصل کی۔ یہ دراصل کمپنی کی کوٹھی یا اس کا تجارتی مرکز تھا۔ بعد میں اس بستی کو وسعت دینے اور تجارتی و حفاظتی مقاصد حاصل کرنے کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کے صوبیدار سے تین گاؤں خرید لئے۔ اس طرح رفتہ رفتہ ایسٹ انڈیا کمپنی سورت، بمبئی، ہگلی، کلکتہ، مدراس اور مچھلی پٹم میں اپنے تجارتی مراکز قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ چونکہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے پہلے پرتگیزی، فرانسیسی اور ولندیزی (ڈچ) اپنی تجارتی کمپنیاں قائم کر چکے تھے۔ ان کے پاس تجارتی جہازوں کے علاوہ جنگی جہاز بھی تھے جو ان کے تجارتی جہازوں اور تجارتی مراکز کی حفاظت کرتے تھے۔ کھلے سمندروں میں ان کی آپس میں جنگیں بھی ہوتی تھیں اس لئے انگریزوں نے بھی اپنی تجارتی کوٹھیوں کے اردگرد مضبوط فصیلیں تعمیر کیں ان کی حفاظت کے لئے مسلح ملازم بھرتی کئے۔ اس طرح ان تجارتی کوٹھیوں کو فوجی قلعوں کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

بادشاہ ہندوستان کی پہلی بے تدبیری

وقت گزرتا گیا۔ انگریز تجارت میں ترقی کرتے گئے۔ لیکن ابھی تک ان کی سرگرمیاں صرف تجارت تک محدود تھیں۔ ہندوستان کی سیاست سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ بادشاہ فرخ سیر کا زمانہ آیا۔ بادشاہ کسی خطرناک مرض میں مبتلا ہوا۔ ایک انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا۔ بادشاہ صحت یاب ہو گیا۔ اس نے خوش ہو کر ڈاکٹر

ہملٹن سے کہا جو چاہو مانگ لو۔ اپنی قوم کے اس سچے ہمدرد نے اپنی ذات کے لئے کچھ طلب نہیں کیا اگر مانگا تو اپنی قوم کے لئے۔ اس نے بادشاہ فرخ سیر کی خدمت میں عرض کیا کہ جہاں پناہ ایسٹ انڈیا کمپنی کو بنگال میں آزادانہ تجارت کی اجازت دیدی جائے اور کمپنی سے تین ہزار روپے سالانہ کی رقم قبول کرلی جایا کرے۔ اس عاقبت نااندیش بادشاہ نے ڈاکٹر ہملٹن کی درخواست قبول کرلی۔ اس طرح انگریز بنگال کی معیشت پر حاوی ہو گئے اور انہیں مالی لحاظ سے غیر معمولی فوائد حاصل ہوئے۔ بنگال کے تاجروں اور صنعت کاروں پر اس کا بے حد خراب اثر پڑا اور ان کی معاشی زبوں حالی کا آغاز ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری اگر کسی پر عائد ہوتی ہے تو وہ بادشاہ فرخ سیر پر۔

انگریزوں کے دوش بدوش دوسری مغربی قوم فرانسیسیوں کی تھی جو ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے مقیم تھی۔ فرانسیسی تجارت کے ساتھ ساتھ یہاں کی ملکی سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگے تھے۔ پانڈی چری فرانسیسیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا یہاں ان کا گورنر رہتا تھا جو ہندوستان میں فرانس کی تجارتی کمپنیوں اور ان کے مفادات کی نگرانی کرتا تھا۔

فرانسیسیوں نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کی حفاظت کے لئے متعدد طاقتور جنگی جہاز اور مضبوط قلعے بنائے اور باقاعدہ فوج ملازم رکھی تھی جس میں سے بیشتر ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔ فرانسیسی فوجی افسر اس کی تربیت کرتے تھے۔ یہ فوج 4 ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی جن میں فرانسیسی پانچ سو سے بھی کم تھے۔(2)

انگریزوں کی سیاست ہند میں پہلی مداخلت

1748ء کا واقعہ ہے کہ دولت آصفیہ (دکن) کے بانی نظام الملک آصف جاہ کا انتقال ہو گیا۔ تخت نشینی کے دو دعویدار تھے۔ نظام الملک مرحوم کا فرزند ناصر جنگ اور نواسہ مظفر جنگ۔ ناصر جنگ تخت سلطنت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر خودغرض اور جاہ طلب مظفر جنگ بھاگ کر پانڈی چری گیا اور فرانسیسی افسروں سے مل کر

درخواست کی کہ اس کی مدد کی جائے۔ دوسری طرف ریاست کرناٹک کے نواب انورالدین اور چندا صاحب میں کشمکش شروع ہو گئی۔ چندا صاحب چاہتا تھا کہ کرناٹک کی نوابی اسے مل جائے۔ وہ بھی پانڈی چری گیا اور فرانسیسیوں سے امداد کا طالب ہوا۔ اس زمانے میں ڈوپلے جیسا ذہین و فریس اور عالی حوصلہ شخص فرانس کی طرف سے پانڈی چری میں گورنر تھا۔ اصولاً" اسے دونوں کو صاف جواب دے دینا چاہیے تھا کہ اس کی کمپنی کا دائرہ کار تجارت تک محدود ہے' سیاسی امور سے کمپنی کے افسروں کا کوئی تعلق نہیں مگر فرانسیسی گورنر نے جب دیکھا کہ خود ہندوستان کے حکمران خاندانوں کے دو بااثر افراد اس سے امداد طلب کر رہے ہیں تو اس نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اپنے ایک جرنیل "بسے" نامی کو ایک طاقتور فوج دے کر جو جدید قواعد جنگ کی ماہر تھی مظفر جنگ اور چندا صاحب کی امداد کے لئے بھیج دیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ ایک مغربی طاقت دو حریف ہندوستانی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت کرنے کی غرض سے ایک طاقت کی حامی و مددگار بن کر میدان جنگ میں اتر رہی تھی۔ اس لحاظ سے یہ کہنا درست ہو گا کہ میر جعفر کی بجائے مظفر جنگ اور چندا صاحب دو پہلے غدار وطن تھے جنہوں نے غیر ملکی اور مغربی طاقتوں کو ہندوستان کے سیاسی اور فوجی معاملات میں مداخلت کا راستہ دکھایا۔

بہرحال جنرل بسے کی امداد سے چندا صاحب ارکاٹ پر اور مظفر جنگ حیدر آباد دکن پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس جنگ میں چندا صاحب کا حریف نواب انورالدین مارا گیا۔ اس کامیابی میں فرانس کی فوجوں کا سب سے بڑا اور اصل حصہ تھا۔ انہی کی امداد سے چندا صاحب ارکاٹ کا اور مظفر جنگ حیدر آباد دکن کے حکمراں بنے تھے۔ گورنر ڈوپلے نے اس امداد کی پوری قیمت وصول کی۔ (3) ڈوپلے خود کرناٹک کا گورنر بنا اور اس کی سرپرستی میں چندا صاحب نواب مقرر ہوا۔

ارکاٹ کے نواب انورالدین کی شکست اور قتل کے بعد اس کا بیٹا محمد علی بھاگ کر انگریزوں کے پاس پہنچا اور ان سے اپنے باپ کے قتل کے انتقام اور ریاست کی دوبارہ واپسی کے سلسلے میں امداد کا طالب ہوا۔ اس وقت مدراس میں انگریزوں کی سب

سے بڑی تجارتی کوٹھی تھی جس میں مختصر سی فوج مقیم تھی۔ انگریز گورنر نے جب دیکھا کہ کرناٹک اور حیدر آباد پر فرانسیسی اثر و نفوذ قائم ہو گیا ہے تو اسے فکر لاحق ہوئی کیونکہ انگریز اور فرانسیسی ایک دوسرے کے شدید دشمن تھے اور باہم نبرد آزما رہتے تھے۔ چنانچہ اس نے مقتول نواب انورالدین کے بیٹے محمد علی کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا اور کلائیو نامی ایک انگریز افسر کو فوج کا ایک دستہ دے کر محمد علی کی امداد کے لئے روانہ کر دیا۔ کلائیو کے ساتھ پانچ سو سپاہیوں کی مختصر سی فوج تھی۔ جس میں دو سو گورے اور تین سو ہندوستانی سپاہی شامل تھے۔ کلائیو بھی ڈوپلے کی طرح باہمت اور فنون جنگ کا ماہر تھا۔ اس نے ارکاٹ پہنچ کر نواب چندا صاحب کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو ماہ تک جاری رہا۔ آخر کلائیو کو فتح ہوئی چندا صاحب کو شکست ہوئی اور محمد علی کرناٹک کا نواب بن گیا۔ یہ 1751ء کا واقعہ ہے۔ کچھ مدت کے بعد نواب محمد علی نے چندا صاحب کو قتل کروا دیا۔ اس طرح کرناٹک فرانسیسی اثر سے نکل کر انگریزی اثر میں آگیا۔ گویا انگریزوں کو ہندوستان کے سیاسی معاملات میں مداخلت کی دعوت پہلی بار ایک ہندوستانی نواب کے بیٹے نے دی۔ اس طرح محمد علی نے اپنی ریاست تو حاصل کر لی مگر اس منحوس ساعت میں اس نے ایک ایسی طاقت کو ملکی سیاست میں ملوث کیا جو آگے بڑھ کر سارے ہندوستان پر قبضہ کر بیٹھی۔

بنگال میں انگریزی حکومت کی بنیاد

ارکاٹ کی جنگ میں کلائیو کی کامیابی نے ہندوستان میں مقیم انگریزوں کے حوصلے بلند کر دیئے۔ اب انہیں تجارت کے علاوہ ایک نیا میدان سیاست بھی مل گیا۔ اس میدان میں ان کے جوہر خوب چمکے۔ اس جوہر کو چمکانے میں خود اہل وطن اور ان کی غداریوں کا دخل تھا۔ 1756ء میں بنگال کے نواب مہابت جنگ علی وردی خاں کا انتقال ہو گیا۔ ان کا نواسہ سراج الدولہ اپنے نانا کا جانشین ہوا جسے خود علی وردی خاں نے اپنی زندگی میں جانشین مقرر کر دیا تھا۔ مگر سراج الدولہ کا ایک اور عزیز شوکت جنگ تخت کا دعویدار پیدا ہو گیا۔ سراج الدولہ کی تخت نشینی کے بعد وہ بھاگ کر کلکتہ آگیا اور

انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا۔ سراج الدولہ نے شوکت جنگ کی واپسی کا مطالبہ کیا مگر کلکتہ کے انگریز حکام نے شوکت جنگ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ بلاشبہ یہ انگریز حکام کی طرف سے پہلی کھلی معاہدہ شکنی تھی۔ انہیں کوئی حق نہ تھا کہ ایک ایسے حاکم کے دشمن کو پناہ دیتے جس کی حکومت سے ان کے معاہدات تھے اور جس کے زیر سایہ وہ پرامن زندگی گزار رہے تھے۔ اسی دوران انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی۔ کلکتہ کے انگریزوں نے اپنے قلعے کی فصیلوں کی مرمت شروع کر دی۔ نواب سراج الدولہ نے حکم دیا کہ فصیلیں گرا دی جائیں انگریز حکام نے یہ موقف اختیار کیا کہ فصیلیں گرا دینے کی صورت میں کلکتہ غیر محفوظ ہو جائے گا اور فرانسیسی دشمنوں کی زد میں آجائے گا۔ سراج الدولہ نے یہ عذر قبول نہ کیا اور کلکتہ پر حملہ کر دیا۔

انگریزوں کو شکست ہوئی اور وہ جہازوں میں سوار ہو کر مدراس بھاگ گئے۔ کچھ نواب سراج الدولہ کی فوج نے گرفتار کر لئے۔ اس خبر نے مدراس کے انگریزوں میں ہل چل ڈال دی۔ وہاں سے کلائیو اور کپتان واٹسن کی قیادت میں انگریزی فوج کلکتہ کی طرف روانہ ہوئی جس میں اکثریت ہندوستانیوں کی تھی۔ نواب سراج الدولہ کا جرنیل میر جعفر کلکتہ کی حفاظت پر متعین تھا۔ اس نے بغیر لڑے کلکتہ انگریزوں کے حوالے کر دیا۔

کلکتہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد نواب سراج الدولہ نے بھی وہی حرکت کی جو حیدر آباد دکن کے مظفر جنگ اور ارکاٹ کے چندا صاحب نے کی تھی یعنی سراج الدولہ نے فرانسیسیوں کو اپنی امداد کے لئے خط لکھا کیونکہ ان دنوں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں خوں ریز جنگ جاری تھی اور سراج الدولہ کا خیال تھا کہ فرانسیسی ضرور اس کی امداد کریں گے مگر اسی اثنا میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ بند ہو گئی اور دونوں نے صلح کر لی اس لئے فرانسیسی سراج الدولہ کو امداد نہیں دے سکے۔ ادھر کلکتہ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد نواب سراج الدولہ اور اس کے امراء کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے جن میں سرفہرست میر جعفر تھا۔ آخر کلائیو اور میر جعفر کے درمیان سازباز ہو گئی اور میر جعفر نے انگریزوں سے وعدہ کیا کہ اگر اسے بنگال کا نواب بنا دیا گیا تو وہ

ایسٹ انڈیا کمپنی کو مراعات دے گا۔

کلائیو اپنی فوج لے کر کلکتہ سے روانہ ہوا۔ 23 جون 1757ء کو پلاسی کے مقام پر نواب سراج الدولہ اور کلائیو کا مقابلہ ہوا۔ انگریزوں کی فوج تعداد اور اسلحہ جنگ کے اعتبار سے نواب سراج الدولہ کی فوج کے مقابلے میں بہت کم تھی مگر جب جنگ شروع ہوئی تو سراج الدولہ کی فوج کا سپہ سالار میر جعفر اپنی فوج کے ہمراہ ایک طرف کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ مٹھی بھر سپاہیوں اور ان کے چند افسروں نے سراج الدولہ کی طرف سے جاں نثاری و وفاداری کا مظاہرہ کیا۔ آخر سراج الدولہ کو شکست ہوئی۔ وہ بھاگ کر مرشد آباد چلا گیا جہاں سے گرفتار ہوا اور میر جعفر کے بیٹے میرن کے حکم سے قتل کر دیا گیا۔ لاش کو ہاتھی پر ڈال کر سارے شہر میں گھمایا گیا۔ اس طرح میر جعفر کی غداری سے بنگال میں انگریزی حکومت کی بنیاد پڑ گئی۔ کلائیو نے میر جعفر کو نواب بنایا۔ میر جعفر نے کلائیو اور کمپنی کی فوج کے دوسرے عہدیداروں کو اتنا انعام و اکرام دیا کہ انہیں مالا مال کر دیا۔ اس جنگ کے جملہ اخراجات میر جعفر نے بنگال کے خزانے سے انگریزوں کو ادا کیے اس کے علاوہ اس خود غرض اور مفاد پرست نواب نے چوبیس پرگنے کا سارا علاقہ بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا جو ان کی دائمی ملکیت قرار پایا۔

چند سال کے بعد انگریزوں نے میر جعفر کو بھی معزول کر دیا اور اس کے داماد میر قاسم کو بنگال کا نواب بنایا۔ میر قاسم تخت حاصل کرنے کے لئے میر جعفر سے بھی دس قدم آگے نکل گیا۔ میر جعفر نے تو صرف چوبیس پرگنے کا علاقہ انگریزوں کو دیا تھا۔ میر قاسم نے اس کے علاوہ بردوان، چاٹگام اور میدنی پور کے علاقے بھی انگریزوں کو بخش دیئے اس طرح بنگال کا قریب قریب ایک تہائی حصہ انگریزی عملداری میں چلا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعد میں میر قاسم نے انگریزوں سے گلوخلاصی کرنے کی کوشش کی مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ اس نے کئی معرکوں میں انگریزوں کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ یہ واقعہ 1767ء کا ہے۔

کلائیو کو اس کی خدمات کے پیش نظر لارڈ کا خطاب دیا گیا اور بنگال کا گورنر مقرر کیا گیا۔ میر قاسم کے بعد ایک بار پھر میر جعفر کو بنگال کا نواب بنایا گیا۔ اس کے انتقال

کے بعد اس کا بیٹا نواب بنا مگر یہ سب کٹھ پتلی حاکم تھے۔ اصل اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ اب انگریزوں کی طاقت اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے حکمران جن میں نظام حیدر آباد، نواب شجاع الدولہ حاکم اودھ اور شاہ عالم بادشاہ اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ان سے امداد و تعاون کے طالب ہوتے تھے۔

شجاع اور شاہ عالم کی بے تدبیری

چنانچہ وہ وقت بھی آ گیا کہ لارڈ کلائیو ایک فاتح کی حیثیت سے الہ آباد گیا جہاں حاکم اودھ شجاع الدولہ اور تخت دہلی کا امیدوار شاہ عالم مقیم تھے۔ کلائیو نے دونوں سے گفتگو کی اور ملک اس طرح تقسیم کیا جیسے وہ خود ہندوستان کا مالک ہے۔ اس تقسیم کے مطابق اودھ پر شجاع الدولہ کی حکومت تسلیم کر لی گئی مگر ساتھ ہی اسے انگریزوں کی فوج اپنی ریاست میں رکھنے پر مجبور ہونا پڑا جس کے اخراجات ادا کرنے کا ذمہ شجاع الدولہ نے لیا۔ ایک انگریز ریذیڈنٹ بھی اس کی نگرانی کے لئے اس پر مسلط کر دیا گیا۔ الہ آباد کا صوبہ شاہ عالم کو دیا گیا۔ بہار اور بنگال مستقل طور پر انگریزوں کے حصے میں آئے اور اب وہ ان صوبوں کے "قانوناً" مالک و حاکم بن گئے۔ شاہ عالم کو بادشاہ ہند تسلیم کر لیا گیا۔ لارڈ کلائیو نے اسے پچیس لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ شاہ عالم نے انگریزوں کی حمایت اور سرپرستی میں الہ آباد میں رہنا منظور کیا۔ اس لحاظ سے ہندوستان کے عین قلب کا علاقہ بھی انگریزوں کے زیر اثر آ گیا۔ یہ معاہدہ 1765ء میں ہوا اور ہندوستان کے خود غرض اور نااہل حکمرانوں کی بے تدبیری پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔

1774ء میں اودھ کے حکمران شجاع الدولہ نے انگریزوں سے سازباز کی اور اپنے ایک مسلمان حریف حافظ الملک نواب رحمت خاں حاکم روہیلکھنڈ کی ریاست پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انگریزی فوج کا ایک بریگیڈ کرنل چیمپن کی سرکردگی میں شجاع الدولہ کی امداد کر رہا تھا۔ 23 اپریل 1774ء کو شاہ جہاں پور کے مقام میراں پور کٹڑہ میں شجاع الدولہ اور انگریزوں کی متحدہ فوج نے نواب رحمت خاں کو شکست دی۔ ان کا سر کاٹ کر شجاع الدولہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ سر لانے والے کو شجاع الدولہ نے ایک ہاتھی اور زر نقد انعام دیا۔ (5) یہی نہیں بلکہ نواب موصوف کا خیمہ بھی لوٹ لیا گیا۔ ان

کے خاندان کی مستورات اور بچوں تک کو ذلیل کیا گیا۔ یہاں تک کہ نواب رحمت خاں مقتول کی بیوہ نے شجاع الدولہ کے مظالم کی لرزہ خیز داستان لارڈ ہیسٹنگز کو بھیجی۔ اس طرح محض حصول زر اور توسیع سلطنت کے لالچ میں شجاع الدولہ نے انگریزوں کی امداد سے ایک مسلمان حکمران کا خون کیا اور اس کی ریاست کو تاراج کیا۔ کیا اس غدار وطن کا یہ جرم قابل معافی ہے؟

ادھر شجاع الدولہ انگریزوں کے ہاتھ میں کھیل رہا تھا اور ادھر غازی الدین خاں وزیر سلطنت کی بے تدبیری اور خود غرضی کی وجہ سے دہلی میں بادشاہت بازیچہ اطفال بنی ہوئی تھی۔ انگریز اور مرہٹے دونوں ایسے شخص کو بادشاہ بنانا چاہتے تھے جو ان کے اشاروں پر چل سکے چنانچہ انہیں عالم گیر ثانی کا بیٹا شہزادہ علی گوہر مل گیا جس نے بہار میں جہاں وہ مقیم تھا اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور شاہ عالم کا لقب اختیار کیا۔ مرہٹوں کی امداد سے پہلے الہ آباد آیا۔ یہاں انگریز حکام نے اس کا استقبال کیا۔ مرہٹوں نے اس سے ایک معاہدہ کیا جس کے تحت سلطنت کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد شاہ عالم نے دس لاکھ روپیہ مرہٹوں کو ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ مرہٹوں کی نگرانی اور سرپرستی میں شاہ عالم دہلی میں داخل ہوا اور دسمبر 1771ء میں تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ جب بادشاہ الہ آباد سے دہلی کو روانہ ہوا تو انگریزی فوج کے افسر کچھ دور تک اس کے ساتھ گئے۔

شاہ عالم سخت نااہل ثابت ہوا۔ کبھی مرہٹے اور کبھی روہیلکھنڈ کے افغان سردار اس پر حاوی ہو جاتے۔ آخر میں وہ مرہٹہ سردار سندھیا کے ہاتھ میں کھلونا بن گیا۔ غلام قادر خاں جسے تاریخ میں غلام قادر روہیلہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے شاہ عالم کو مرہٹوں کے تسلط سے نجات دلوانے کی خاطر دہلی آیا اور مرہٹوں کو دہلی سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو گیا مگر شاہ عالم نے پھر سندھیا سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ اس کا ایک خط غلام قادر کے ہاتھ لگ گیا اور اس نے جوش غضب سے مغلوب ہو کر شاہ عالم کی آنکھیں نکال کر بینائی سے محروم کر دیا اور پھر قید میں ڈال دیا۔ مرہٹوں نے شاہ عالم کو غلام قادر خاں کی قید سے رہا کرانے کے لئے دہلی پر حملہ کیا۔ غلام قادر خاں قتل ہوا۔ نابینا شاہ عالم

پھر تخت پر بٹھا دیا گیا۔ مرہٹے اس کے نام پر حکمرانی کرنے لگے۔ ان ہنگاموں اور جدال و قتال میں دہلی اور روہیلکھنڈ کے عوام خصوصاً" روہیلہ افغان تباہ و برباد ہو گئے۔

روہیلہ افغانوں کی خود غرضی

حقیقت یہ ہے کہ خود روہیلہ سرداروں میں حصول اقتدار کی خاطر سخت اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور ان میں سے بعض نے اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے بڑی شرمناک حرکتیں کیں۔ ضابطہ خاں ایسے ہی بدکردار اور خود غرض روہیلہ سرداروں میں سے تھا جس نے سلطنت دہلی کی امیر الامرائی حاصل کرنے اور اپنی ریاست قائم رکھنے کے لئے کبھی سکھوں اور کبھی مرہٹوں سے عہد و پیماں کئے۔ انہیں اپنی امداد کے لئے بلایا اور ان کے ہاتھوں شمالی ہند کے بہت سے شہروں کو تاراج کروایا۔ آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ بعض دفعہ مرہٹے روہیلوں پر حاوی ہو گئے اور دوسری طرف بادشاہ وقت شاہ عالم ان کا دست نگر اور محتاج ہو کر رہ گیا۔

آخر 1803ء میں انگریزی فوج کا سپہ سالار جنرل لیک دہلی پر حملہ آور ہوا۔ مرہٹوں کو شکست دے کر نکالا اور ایک لاکھ روپیہ سالانہ پنشن مقرر کر کے شاہ عالم کا اقتدار دہلی شہر تک محدود کر دیا۔ اس تاریخ ساز واقعے کی روداد خود آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے بیان کی ہے اور اعتراف کیا ہے کہ لارڈ لیک کو خود شاہ عالم نے بلوا کر اقتدار اس کے سپرد کیا تھا۔ اس کے بعد بہادر شاہ ظفر تک جتنے بادشاہ ہوئے سب انگریزوں کے پنشن خوار اور نام کے بادشاہ تھے۔ اقتدار انگریزوں کے ہاتھ میں تھا۔ 1857ء میں یہ برائے نام اقتدار بھی ختم ہو گیا اور دہلی کا لال قلعہ مغل بادشاہ کے وجود سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا۔

سلطان ٹیپو کی شہادت

اسی دور میں میسور کے شیر دل اور باہمت حکمراں نواب حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے کی کوشش کی مگر افسوس کہ دونوں کو کامیابی نہ ہو سکی کیونکہ نظام حیدر آباد اور مرہٹوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اگر نظام

انگریزوں کا ساتھ نہ دیتا اور نواب حیدر علی کی پیش کش قبول کر کے تعلقات محبت استوار کر لیتا تو بلاشبہ انگریزوں کا ہندوستان پر قابض ہونا بہت مشکل تھا۔ ان کی یہ مشکل اہل وطن اور ایک مسلمان حکمران ریاست (نظام دکن) نے آسان کر دی۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ سلطان ٹیپو کی طاقت سے انگریز، نظام دکن اور مرہٹے تینوں خوفزدہ تھے اس لئے ان تینوں کے درمیان معاہدہ ہوا کہ سلطان کی طاقت ختم کر دی جائے اور اس کا ملک آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔ چنانچہ پہلے 1791ء میں اور پھر 1799ء میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام دکن کی متحدہ فوجوں نے سلطان ٹیپو پر حملہ کیا۔ 4 مئی 1799ء کو آخری معرکے میں سلطان بہادرانہ جنگ کرتا شہید ہوا۔ اس طرح خود اپنوں کی غداریوں کی بدولت ایک مسلم ریاست تاراج ہوئی اور انگریز اپنے سب سے بڑے اور آخری دشمن کو اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی مرہٹوں کی قوت بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی اور نظام دکن انگریزوں کا طابع فرماں بن کر رہ گیا۔ اس سانحہ عظیم کے بعد ہی انگریزوں کو دہلی کی طرف پیش قدمی کرنے کی جرات ہوئی۔ اس کے بعد کوئی ان کا راستہ روکنے والا نہ تھا۔

حواشی:

1- اوکس ہس کی تاریخ ص 379-

2- دی ہسٹری آف انڈیا ص 238 جلد نمبر1 مولفہ جان کلارک مارشمین۔

3- مارشمین نے لکھا ہے کہ 81 گاؤں نواب مظفر جنگ نے ڈوپلے کو بخش دیئے، دی ہسٹری آف انڈیا ص 241 جلد نمبر1، مولفہ مارشمین۔

4- دی ہسٹری آف انڈیا ص 246 جلد نمبر1 مولفہ جان کلارک مارشمین۔

5- حیات حافظ رحمت خاں ص 225 مولفہ سید الطاف علی بریلوی۔

1857ء کی بغاوت

گزشتہ صفحات میں برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ زوال کی جو روداد بیان کی گئی ہے اس سے اتنی بات تو واضح ہے کہ مسلمانوں کی سلطنت کو خود مسلمانوں نے برباد کیا۔ انہوں نے اپنے مسلمان حریفوں کو ذلیل کرنے کے لئے مرہٹوں، سکھوں اور ہندو جاٹوں کو استعمال کیا اور پھر یہ لوگ اتنے طاقتور ہو گئے کہ سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی جانیں، اموال اور عزتیں ان کے ہاتھوں دن کی روشنی میں لٹنے لگیں، کوئی انہیں روکنے والا نہ تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کو خود مسلمان حکمرانوں نے ملکی سیاست میں ملوث کیا اور حصول اقتدار کے لئے استعمال کیا پھر ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گئے۔ 1856ء میں اودھ کے نالائق اور عیاش نواب جان عالم پیا (واجد علی شاہ اختر) کو انگریزوں نے جس آسانی سے معزول کیا (جس کا انہیں کوئی حق نہ تھا) اس سے ثابت ہو گیا کہ ان کے اقتدار کو للکارنے والا کوئی باقی نہ رہا تھا۔ سکھوں کے اقتدار کے خاتمے کے بعد پنجاب کے مسلمانوں نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان کی ذلت و رسوائی کا دور ختم ہو گیا تھا۔ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ 1857ء میں کوئی ایک ہاتھ بھی ایسا نہ تھا جو مسلمانوں کو مجتمع کر سکتا اور انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر مسلمانوں کا اقتدار بحال کر سکتا۔

یہ تھے وہ حالات جب سرسید احمد خاں ہندوستان کے مطلع شہرت پر نمودار ہوئے۔ انہوں نے دہلی کے لال قلعے میں تیموری بادشاہ کی کسمپرسی کا بھی بچشم خود مشاہدہ کیا اور انگریزوں کے اقتدار اور قوت کے مظاہر بھی دیکھے۔ وہ ایک ذہین، دوربین اور صحیح الفکر مدبر تھے۔ تاریخ پر نظر رکھتے تھے اور جانتے تھے کہ موجودہ حالات میں انگریزوں کے خلاف کوئی قدم اٹھانا قومی خودکشی کے مترادف ہے۔ اسی اثناء میں 10 مئی

1857ء کو بارک پور (میرٹھ) میں ہندوستانی فوجوں نے انگریز افسروں کے خلاف بغاوت کردی۔ یہی بغاوت ہمارا اصل موضوع ہے۔ باغیوں نے میرٹھ میں اپنے انگریز افسروں کو قتل کیا۔ چھاؤنی میں آگ لگائی۔ جیل کے دروازے کھول کر اپنے ساتھیوں کو رہا کرا لیا جنہیں ایک دن قبل انگریز فوجی حکام نے اپنی بے تدبیری کی وجہ سے بیڑیاں پہنا کر قید کر دیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دہلی کا رخ کیا۔ لال قلعے کے پاس جمع ہو کر بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) سے درخواست کی کہ ان کی سرپرستی کی جائے۔ بہادر شاہ کو بادشاہ بنانے کے بعد دہلی باغیوں کا مرکز بن گیا۔ انگریز افسر قتل کر دیئے گئے۔ ان کے بیوی بچوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ دہلی پر باغیوں کا مکمل قبضہ ہو گیا۔ اس خبر نے دوسرے شہروں کی دیسی پلٹنوں کو بھی بغاوت پر اکسایا۔ رفتہ رفتہ بریلی، شاہجہان پور، بجنور، کانپور، لکھنؤ، گورکھپور، الہ آباد، آگرہ، علی گڑھ، مظفر نگر، بدایوں اور جھانسی وغیرہ بہت سے شہروں میں دیسی فوجوں نے دہلی کا رخ کیا۔ اس طرح دہلی کے علاوہ یوپی کے بہت سے شہروں سے انگریزوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا اور یہ شہر مکمل طور پر باغیوں کے قبضے میں آ گئے۔ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی طرف سے ان شہروں کے لئے حاکم نامزد کئے گئے جنہوں نے شاہ دہلی کی طرف سے ان شہروں کا انتظام سنبھال لیا۔ انگریزوں کے خلاف ہنگامہ جدال و قتال 10 مئی 1857ء کو شروع ہوا اور 19 ستمبر 1857ء کو دہلی پر انگریزی فوج کے دوبارہ قبضے کے بعد اس کی شدت ختم ہونے لگی۔ قریباً چار ماہ دہلی باغیوں کے قبضے میں رہی۔ یہی مدت بغاوت کے عروج کی تھی۔ دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے ساتھ ہی دوسرے شہروں پر قابض باغی فوجوں کی ہمتیں پست ہونے لگیں اور انگریزی فوج کے حوصلے بلند ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ 1858ء کے وسط تک ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ بلاشبہ اس بغاوت میں بعض شخصیتوں مثلاً بخت خاں، احمد اللہ شاہ مدراسی، رانی جھانسی، تانتیاٹوپی، خان بہادر خاں، علی محمد خاں عرف ممو خاں، راجہ جے لال سنگھ، عظیم اللہ خاں اور مولانا لیاقت علی الہ آبادی نے بڑی بہادری اور سرفروشی کے کارنامے سرانجام دیئے جن کا خود انگریز مصنفوں اور مورخوں نے اعتراف کیا ہے۔ لیکن ان کا دائرہ کار بہت محدود رہا اور یہ لوگ بھی جم کر نہ لڑ سکے اس لئے یہ بغاوت ناکام ہوئی۔ نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ

ہندوستان کے ہزاروں خاندان نان شبینہ کو محتاج ہو گئے، لاکھوں مسلمان انتقامی کارروائی کا نشانہ بنے۔ انہیں انگریزی فوجوں نے اذیتیں دے دے کر ہلاک کر دیا۔ شہر کے شہر راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ عصمت مآب عورتیں بے آبرو ہوئیں اور فاتح فوجوں نے جن میں بکثرت دیسی فوجی شامل تھے انتقام کی آگ بجھانے کے لئے نہتے اور بے گناہ شہریوں پر وہ مظالم کئے کہ چنگیز اور ہلاکو کی روحیں بھی لرز اٹھی ہوں گی۔ خود منصف مزاج انگریز مورخوں اور مصنفوں نے فاتح فوجوں کی سفاکی دیکھ کر ان پر نفریں بھیجی۔

سرسید احمد خاں اور ان کے بعض ہم عصروں نے انہی اندیشوں کی بنا پر 1857ء کی بغاوت کی مخالفت کی تھی اور مسلمانوں کو سمجھایا تھا کہ وہ انگریزوں کے خلاف یہ قدم نہ اٹھائیں۔ انہوں نے اپنے محدود ترین دائرے میں باغیوں کو ان کے اقدامات سے باز رکھنے کی کوشش بھی کی اور اس کوشش میں بعض دفعہ قتل ہوتے ہوتے بچے۔

سرسید احمد خاں نے ایسا کیوں کیا؟ یہی سوال ہماری بحث و گفتگو کا اصل موضوع ہے۔

انقلاب کی کامیابی کی پانچ شرائط

کسی انقلاب کی کامیابی کے لئے مندرجہ ذیل پانچ شرائط ضروری ہیں۔

(1) ایک مرکزی شخصیت موجود ہو جس کے اردگرد تحریک گردش کرتی ہو۔ یہ مرکزی شخصیت جسمانی اور دماغی لحاظ سے قوی ہو۔

(2) انقلاب میں شامل لوگ اس سے محبت بھی کرتے ہوں اور بے چون و چرا اس کی اطاعت بھی کرتے ہوں۔

(3) انقلاب یا بغاوت میں شامل افراد کے پیش نظر ذاتی اغراض نہ ہوں بلکہ بلند نصب العین ہو۔

(4) انقلابیوں کے درمیان باہمی روابط قائم ہوں، نظم و ضبط ہو اور طے شدہ منصوبے کے بعد اقدام کیا جائے۔

(5) انقلابیوں کی فتوحات اور اثرات کا دائرہ مسلسل بڑھتا رہے یہاں تک کہ

اگر سارے ملک پر نہیں تو ملک کے بڑے حصے پر محیط ہو جائے۔ جب تک یہ شرائط پوری نہ ہوں اس وقت تک کوئی بغاوت یا انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا۔ آیئے دیکھیں کہ 1857ء کی بغاوت کے اجزائے ترکیبی کیا تھے اور کیا اس میں مندرجہ بالا پانچ شرائط موجود تھیں۔

بہادر شاہ ظفر کی شخصیت

10 مئی 1857ء کو میرٹھ کی دیسی سپاہ نے علم بغاوت بلند کر کے دہلی کا رخ کیا تاکہ بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ بنا کر اپنی انقلابی جدوجہد کا آغاز کریں۔ اس طرح انہیں ایک مرکزی شخصیت مل گئی۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ 1857ء میں ایک مرکزی شخصیت موجود تھی۔ مگر اس مرکزی شخصیت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کی کیا کیفیت تھی؟ اور اس نے اس انقلاب میں کیا کردار ادا کیا؟ ان دونوں سوالوں کا جواب معلوم ہونے کے بعد ہی اصل حقیقت ظاہر ہو سکتی ہے۔

واقعات ثابت کرتے ہیں کہ میرٹھ کی باغی فوجوں کے دلی پہنچنے سے قبل بہادر شاہ ظفر نئے رونما ہونے والے حالات سے بالکل بے خبر تھا نہ اسے اعتماد میں لیا گیا تھا۔ اس کا باغیوں سے کسی قسم کا کوئی رابطہ نہ تھا۔ 11 مئی 1857ء کی صبح کو اچانک باغی فوجیں لال قلعے کے کلکتہ دروازے کے سامنے پہنچ گئیں۔ شاہی جھروکے کے نیچے کھڑے ہو کر باآواز بلند بادشاہ کو مخاطب کیا اور کہنے لگیں کہ ہم میرٹھ کے انگریزوں کو قتل کر آئے ہیں۔ دین کے لئے جنگ کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ حضور ہمارے دین اور دنیا کے گسیاں (سردار) ہیں ہمارے سر پر ہاتھ رکھیے اور ہماری مدد فرمایئے۔ جب بادشاہ نے اپنی خواب گاہ کے قریب شور و غل سنا تو اس نے ایک شخص کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے بھیجا اس نے واپس آ کر سارا ماجرا سنایا۔ بادشاہ نے اسی وقت ایک سوار کو دہلی کے انگریز کمشنر کے پاس روانہ کیا اور اسے اس واقعے سے مطلع کیا۔ کمشنر کے آنے سے قبل ہی باغی فوجیں قلعے میں داخل ہو گئیں اور بادشاہ کے سامنے پہنچ کر اس سے درخواست کی کہ حضور ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں، ہماری سرپرستی قبول فرمائیں۔ راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی جو بادشاہ کے ماہی خانے کے داروغہ اور ان کے مصاحب تھے اس وقت قلعے میں

موجود تھے اپنی کتاب "داستان غدر" میں انہوں نے اس واقعے کا چشم دید حال لکھا ہے۔ ان کی کتاب اس موضوع پر مستند سمجھی جاتی ہے اور مولانا غلام رسول مہر جیسے فاضل نے بھی ان کی کتاب کو مستند قرار دیا ہے اور اپنی کتاب "1857ء" میں جگہ بہ جگہ اس سے استفادہ کیا ہے اور حاشیے میں اس کے حوالے درج کئے ہیں۔ پہلے مہر صاحب کی کتاب سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

"بہادر شاہ ظفر جھروکے میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے تھے نیچے (ہوا خوری کے لئے جانے کی غرض سے) سواری تیار تھی کہ یکایک جھروکے سے ہنکارے کی آواز آئی۔ میر فتح علی ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ اشارہ سبابہ (ہاتھ کی انگلی سے بادشاہ نے) دریا کے پل کی جانب اشارہ کیا۔ دیکھا تو دریا پار میر بحر کے بنگلے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ میر فتح علی نے رسالدار کو حکم دیا کہ سوار بھیج کر خبر منگواؤ۔ سواروں نے کوئی پانچ منٹ میں واپس آ کر خبر دی کہ غنیم دلی پر چڑھ آیا ہے۔ اس کی فوج نے تاخت و تاراج پر کمر باندھی ہے۔ بنگلہ پھونک دیا، میر بحر کو مار ڈالا، مال کا صندوق لوٹ لیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ پل توڑ دیا جائے، کشتیاں کھینچ لی جائیں، شاہی فوج موقع پر چلی جائے، کوتوال تمام دروازے بند کرا دے۔ اس اثنا میں سوار سلیم گڑھ کے نیچے سے ہوتے ہوئے جھروکے کے نیچے پہنچے۔ جو لوگ مختلف دروازوں سے باہر نکلے تھے وہ سب گرتے پڑتے اندر آئے اور دروازے بند کر لئے" (1)

اسی دوران دہلی کا انگریز کمشنر فریزر، قلعہ دار ڈگلس کے ہمراہ بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا اور سارا ماجرا سن کر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور بالکل فکر نہ کریں میں باغیوں کو سمجھانے جاتا ہوں۔ یہ سن کر بادشاہ اور شاہی طبیب حکیم احسن اللہ خان نے کمشنر فریزر کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا ہم آپ کو نہیں جانے دیں گے کیونکہ خطرہ ہے کہ باغی ان پر گولی نہ چلا دیں مگر فریزر نے بادشاہ سے عرض کیا حضور کے اقبال سے سب ٹھیک ہو جائے گا میں جا کر سمجھائے دیتا ہوں یہ کہہ کر فریزر برآمدے میں آیا اور باغیوں سے مخاطب ہو کے کہا کہ یہ بادشاہ کی خواب گاہ ہے تم لوگ شور و غل سے حضور (بادشاہ) کو تکلیف نہ دو۔ یہ جگہ فریاد سننے کی نہیں_ کوٹلہ کی طرف سے آؤ۔ وہاں جو کچھ کہنا ہو

عرض کر دینا ضرور شنوائی ہوگی- باغی فوجیں کوٹلے کی طرف سے آئیں اور ان کے کچھ سوار قلعے میں داخل ہو گئے- یہ بیان مولانا غلام رسول مہر کا ہے لیکن خود راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی کے بیان سے جو اس واقعے کے چشم دید گواہ ہیں معلوم ہوتا ہے کہ کمشنر فریزر کے آنے سے قبل ہی باغی قلعے میں داخل ہو گئے تھے اور بادشاہ سے درخواست کی تھی کہ ان کی سرپرستی فرمائی جائے-

بادشاہ ظفر کی تقریر

اس موقع پر بہادر شاہ ظفر نے باغی فوجوں کے سرداروں کو مخاطب کر کے جو تقریر کی وہ ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب میں درج کی ہے- بادشاہ نے کہا کہ:-

”سنو بھائی! مجھے بادشاہ کون کہتا ہے میں تو فقیر ہوں ایک تکیہ بنائے ہوئے اپنی اولاد کو لئے بیٹھا ہوں بادشاہت تو بادشاہوں کے ہمراہ گئی- میرے باپ دادا بادشاہ تھے جن کے قبضے میں ہندوستان تھا سلطنت تو سو برس پہلے میرے گھر سے جا چکی تھی- میرے جدو آبا کے نوکر چاکر اپنے خداوندان نعمت کی اطاعت سے جداگانہ رئیس بن بیٹھے- میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا- قوت لایموت کو محتاج ہو گئے- خصوصاً" میرے جد بزرگوار حضرت شاہ عالم بادشاہ غازی کو جب غلام قادر نمک حرام نے قید کر کے نابینا کیا تو پہلے مرہٹوں کو طلب کیا گیا تھا اور انہوں نے اس نمک حرام کو کیفر کردار کو پہنچایا- حضرت بادشاہ کو قید سے چھڑایا- چند سال مرہٹے بادشاہ کی جانب سے مختار رہے مگر بادشاہ کے صرف مطبخ (باورچی خانے) کا بندوبست بھی نہ کر سکے لاچار ہو کر میرے دادا نے منجانب سلطنت برطانیہ رجوع کیا اور انگریزوں کو بلوا کر اپنے گھر کا مختار فرمایا اور ملک ہندوستان ان کو تفویض کیا اور ان لوگوں نے حسب دل خواہ اخراجات شاہی کا بندوبست کر دیا اور ملک میں امن و امان کا ڈنکا بجایا- اس روز سے آج تک ہم لوگ یہ عیش و عشرت تمام بسر کرتے چلے آ رہے ہیں- ہمیں کسی طرح کا فکر و اندیشہ دامن گیر نہیں------ لڑائی جھگڑے سے کچھ کام نہیں اس کا انسداد اور انتظام انگریز لوگ

خود کر لیتے ہیں- میں تو اک گوشہ نشیں آدمی ہوں- مجھے ستانے کیوں آئے ہو- میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں گا' میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمہاری امداد کروں گا' میرے پاس ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تمہیں نوکر رکھوں گا' میں کچھ نہیں کر سکتا' مجھ سے کسی قسم کی توقع استعانت کی نہ رکھو' تم جانو یہ لوگ جانیں- ہاں ایک امر میرے اختیار میں ہے کہ میں تمہارے درمیان میں ہو کر انگریزوں سے تمہاری صفائی کرا سکتا ہوں تم ابھی یہیں ٹھہرے رہو میں نے صاحب ریذیڈنٹ کو بلوایا ہے وہ میرے پاس آنے والے ہیں' پہلے میں ان سے دریافت کر لوں' ان کی زبانی مجھے حال فتنہ و فساد معلوم ہو جائے گا اور خدا چاہے تو میں اس فساد کو رفع دفع کرا دوں گا“ (2)

بہادر شاہ ظفر کی اس ساری تقریر کا مطالعہ کرنے کے بعد صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ باغیوں کو مفسد سمجھتا تھا- انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے پر کسی طرح آمادہ نہ تھا- اپنی موجودہ حالت پر قانع اور خوش تھا بلکہ اسے عیش و آرام کی زندگی قرار دیتا تھا- شاہی قلعہ کو فقیر کا تکیہ کہتا تھا- اس نے صاف کہا کہ نہ میرے پاس خزانہ ہے نہ فوج کہ میں تمہاری امداد کروں نہ ملک کہ جس کی آمدنی سے تمہیں تنخواہ دوں- اس نے باغیوں کو مشورہ دیا کہ انگریزوں کی اطاعت کرو- پیش کش کی کہ میں تمہارے اور انگریزوں کے درمیان پڑ کر صلح صفائی کرا دوں گا- جب اسے باغیوں کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ انگریز کمشنر کو مطلع کیا تاکہ وہ گورا فوج اور وفادار سپاہیوں کی امداد سے باغیوں کو شکست دے کر دہلی کو باغیوں کے ہاتھ میں جانے سے بچائے- اس نے اپنے ذاتی سپاہیوں کو حکم دیا کہ دریا کا پل توڑ دیا جائے اور کشتیاں کھینچ لی جائیں تاکہ باغی دریا پار کر کے شہر میں داخل نہ ہونے پائیں- یہی نہیں بلکہ شاہی فوج کو حکم دیا کہ موقع پر پہنچو اور باغیوں کو شہر میں آنے سے روکو- اس نے اپنی تقریر میں دو اور امور کی طرف اشارے کئے- ایک یہ کہ اس کے جد بزرگوار شاہ عالم ثانی نے مرہٹوں کے ہاتھوں تنگ آ کر خود انگریزوں کو دہلی بلوایا' انہیں اپنے گھر کا مختار بنایا اور سلطنت انہیں تفویض کر دی- بہادر شاہ کے بقول انگریزوں نے دہلی آ کر اور شاہ عالم سے سلطنت لے کر امن و امان کا ڈنکا بجوایا اور اہل شہر کو مرہٹوں کی لوٹ مار اور قتل و

غارت سے نجات دلوائی۔ دوسرے الفاظ میں بہادر شاہ ظفر نے انگریزوں کو ہندوستان کا قانونی اور آئینی حکمران ثابت کیا۔

کیا ان حقائق سے واضح نہیں ہو جاتا کہ باغی فوجوں نے جس شخصیت کو بغاوت کا مرکزی کردار بنایا تھا وہ دل سے ان کا مخالف اور انگریزوں کا حامی تھا۔ اس نے امکان بھر کوشش کی کہ دہلی پر باغیوں کا قبضہ نہ ہونے پائے۔ بعض لوگ جنہوں نے 1857ء کو جہاد آزادی ثابت کرنے اور تاریخ کو اپنے جذبات کے تابع کرنے کی قسم کھا رکھی ہے یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ بلاشبہ ابتدا میں بہادر شاہ ظفر کے یہی خیالات تھے مگر جب دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا' انگریز قتل کر دیئے گئے اور یوپی کے کچھ اور شہر بھی باغی فوجوں کے قبضے میں آ گئے تو بہادر شاہ ظفر کے خیالات میں تغیر عظیم پیدا ہو گیا وہ دل سے باغیوں کا حامی و سرپرست بن گیا اور ان کی کامیابی کے لئے ہ امکانی کوشش کی۔ یہ خیال بھی ان لوگوں کا واہمہ ہے جو 1857ء کے ہنگامے کو جہاد آزادی ثابت کرنے کی کوشش میں تاریخ کو مسخ کرتے ہیں۔

بہادر شاہ ظفر کی ایک اور تقریر سے اس تخیل کے تانے بانے تار عنکبوت کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب دلی پوری طرح باغی فوجوں کے تسلط میں تھا۔

بہادر شاہ کی نظر میں باغیوں کا مقام:

راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ "ایک رات میں ڈیوڑھی پر موجود تھا۔ پچھلا پہر تھا کہ باریدار نے محل میں آواز دی "ہشیار ہو جاؤ" _ ہم لوگ جلدی سے پگڑیاں سر پر رکھ کر کمریں باندھ کر تیار ہو گئے۔ اس وقت ہم چار پانچ آدمی حاضر تھے ---- کہ بادشاہ برآمد ہوئے اور تسبیح خانے میں سنگ مرمر کے تختے پر بیٹھ گئے اور ہم سے فرمایا تم جانتے ہو آج کل جو سامان ہو رہا ہے اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ حاضرین نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور ڈیڑھ سو برس کے بعد حضور کا اقبال یاور ہوا ہے۔ گئی ہوئی سلطنت پھر واپس آئی ہے۔ بادشاہ سلامت نے ارشاد فرمایا تم لوگ نہیں جانتے ہو جو کچھ میں جانتا

ہوں ---- میں تو اک گوشہ ایزدی میں فقیر کا تکیہ بنائے ہوئے چار صورتوں کو ہمراہ لئے بیٹھا روٹی کھاتا تھا۔ میرے بگڑنے کا کوئی سامان نہ تھا۔ اب جو منجانب اللہ میرٹھ میں آگ لگی اور دلی میں آ کر بھڑکی' فتنہ برپا ہوا تو معلوم ہوا فلک غدار اور زمانہ ناہنجار کو میرے گھر کی تباہی منظور ہے۔ آج تک سلاطین چغتائی کا نام چلا آتا تھا اور اب آئندہ کو نام و نشاں (بھی) یک قلم معدوم و نابود ہو جائے گا۔ یہ نمک حرام جو اپنے آقاؤں سے منحرف ہو کر یہاں آ کر پناہ پذیر ہوئے ہیں کوئی دن میں ہوا ہوئے جاتے ہیں۔ جب یہ اپنے خاوندوں (یعنی آقاؤں) کے نہ ہوئے تو میرا کیا ساتھ دیں گے۔ یہ بدمعاش میرا گھر بگاڑنے آئے تھے بگاڑ چلے۔ ان کے جانے کے بعد انگریز لوگ میرا اور میری اولاد کا سر کاٹ کر قلعے کے کنگرے پر چڑھا دیں گے اور تم لوگوں میں سے کسی کو باقی نہ چھوڑیں گے اور اگر کوئی رہ جائے گا تو آج کا قول میرا یاد رکھو کہ تم روٹی کا ٹکڑا منہ میں لوگے اور وہ منہ میں سے اڑ کر دور جا پڑے گا اور رؤسائے ہند کو لوگ ایسا سمجھیں گے جیسے گاؤں کا ایک ادنیٰ آدمی ہوتا ہے۔"(3)

بہادر شاہ ظفر کی یہ تقریر ان کی اس مایوسی اور احساس ناکامی کی منہ بولتی تصویر ہے جو 1857ء کی بغاوت کے انجام کی صورت میں انہیں نظر آ رہی تھی۔ باغیوں کی نااتفاقی' بادشاہ سے منسوب احکام کی نافرمانی' لوٹ کھسوٹ اور بدنظمی و ابتری نے جو صورت حال پیدا کر رکھی تھی بہادر شاہ ظفر اس سے سخت نالاں تھے۔ انہوں نے باغیوں کو جن خطابات سے نوازا وہی خطابات سرسید احمد خاں اور ان کے بعض بزرگ معاصرین نے باغیوں کو دیئے تو ان حضرات کو غدار اور انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا جبکہ خود بہادر شاہ ظفر نے نہایت سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے باغیوں کو نمک حرام' بدمعاش اور اپنے آقاؤں سے غداری کرنے والا قرار دیا۔

بعض لوگ بہادر شاہ ظفر کی یہ تقریر پڑھ کر عجیب موقف اختیار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ بادشاہ نے یہ تقریر اس وقت کی جب بعض شہروں پر انگریزوں کے دوبارہ تسلط اور باغیوں کی شکست کی خبریں آنے لگیں ورنہ درمیانی عرصے میں وہ نہایت پر امید اور باغیوں کے ساتھ تھے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں وہ بہادر شاہ کے وہ فرمان

پیش کرتے ہیں جو دلی پر باغیوں کے چار ماہ تک تسلط کے دوران ان کی طرف سے جاری ہوئے۔ یہ نظریہ اور خیال بھی محض خوش فہمی اور تاریخ کو اپنے جذبات کے سانچے میں ڈھالنے کی ناپسندیدہ بلکہ مجرمانہ کوشش ہے۔

بہادر شاہ کا عدالتی بیان

دلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد جب بہادر شاہ ظفر نے جاں بخشی کے وعدے پر خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا اور لال قلعے میں ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنی صفائی میں ایک بیان داخل کیا تھا جس کے آخر میں یہ الفاظ تحریر تھے۔

"مذکورہ بالا جواب میرا خود تحریر کیا ہوا ہے اور بلا مبالغہ ہے۔ حق سے اصلا انحراف نہیں کیا ہے۔ خدا میرا عالم و شاہد ہے کہ جو کچھ صحیح تھا جو کچھ مجھے یاد تھا وہ میں نے لکھا ہے۔ شروع میں میں نے حلفیہ کہا تھا کہ میں بغیر بناوٹ اور بغیر ملاوٹ کے وہی لکھوں گا جو حق اور راست ہو گا چنانچہ ایسا ہی میں نے کیا ہے"۔ دستخط بہادر شاہ بادشاہ۔

بہادر شاہ ظفر کے بارے میں جو دل چاہے کہہ لیجئے مگر ایک بات جس سے ان کا بڑے سے بڑا دشمن بھی انکار نہیں کر سکتا یہ ہے کہ وہ نہایت متقی، پرہیزگار اور عبادت گزار شخص تھے۔ راست بازی ان کا شعار تھی۔ ان کی پوری زندگی میں کسی نے ان پر دروغ گوئی کا الزام نہیں لگایا تھا۔ پھر انگریز ان کی، ان کی ملکہ زینت محل اور شہزادے جواں بخت کی جاں بخشی کر چکے تھے۔ مقدمے کی کارروائی شروع ہوتے ہی سرکاری وکیل نے عدالت کی خدمت میں عرض کر دیا تھا کہ "نام نہاد بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی جاں بخشی کا وعدہ کر لیا گیا ہے اس لئے اس قابل احترام عدالت کا دائرہ کار حالات و واقعات کی تحقیق کرنے، اسباب بغاوت کا سراغ لگانے اور بادشاہ پر فرد جرم لگانے تک محدود ہے"۔ ان حالات میں کوئی وجہ نہیں کہ بادشاہ ظفر نے غلط بیانی سے کام لیا ہو جب کہ بعض دوسرے شواہد بھی اس کی تائید کرتے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنے بیان

میں کہا کہ:-

"باغی سپاہ دیوان خانے میں گھس آئی۔ عبادت خانے میں ہر طرف پھیل گئی اور مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرہ متعین کر دیا۔ میں نے ان کا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کے لئے کہا جس کے جواب میں انہوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا اور کہا کہ جب انہوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا ہے تو اب اپنی طاقت کے موافق سب کچھ کر کے چھوڑیں گے۔ خوف کھا کر کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں میں نے منہ سے اف تک نہ کی اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا"۔

"بعد ازاں فوجیں مرزا مغل اور مرزا خضر سلطان اور مرزا ابوبکر کو میرے سامنے لائیں اور کہا کہ ہم انہیں اپنا سردار بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کی درخواست رد کر دی لیکن جب سپاہ ضد کرنے لگی اور مرزا مغل غصے ہو کر اپنی والدہ کے مکان میں چلا گیا تو میں سپاہیوں کے خوف سے ساکت رہ گیا اور پھر طرفین کی رضامندی سے مرزا مغل کمانڈر انچیف فوج مقرر ہوا"۔

"میری مہر کے ثبت شدہ اور دستخط کئے ہوئے احکام کی نسبت معاملے کی اصل یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی انگریزی افسروں کو قتل کیا اور مجھے مقید کر لیا میں ان کے اختیار میں رہا جیسا کہ اب ہوں (یعنی انگریز حکام کے اختیار میں) تمام کاغذات جو مناسب سمجھتے میرے پاس لاتے اور مجھے مہر ثبت کرنے پر مجبور کرتے۔ بسا اوقات احکام کے مسودے لاتے اور میرے سیکرٹری سے انہیں صاف کرواتے۔ کبھی اصل کاغذات لاتے اور ان کی نقلیں دفتر میں رکھ دیتے اس لئے کئی خطوط اور مختلف تحریریں روداد کی فائل بن گئی ہیں۔ بارہا انہوں نے خالی لفافوں پر مہر ثبت کرا لی ہے۔ نہیں معلوم ان میں انہوں نے کون سے کاغذات بھیجے اور کہاں بھیجے------ بدوں میرے جتنے احکام چاہتے لکھ لیتے اور مجھے ان کے خلاصے تک سے اطلاع نہیں کی جاتی تھی۔ میں اور میرا سیکرٹری جان کے خوف سے کسی معاملہ میں کچھ نہیں کہتے تھے"۔

(انہوں نے) "ملکہ زینت محل پر (انگریزوں سے) سازش کا الزام لگایا۔ ایک روز حکیم احسن اللہ خاں کا مکان لوٹ لیا، بارادہ قتل انہیں مقید کر دیا میری منتیں کرنے

پر اپنے ارادے سے باز رہے---- میرے دیگر ملازموں کو گرفتار کر لیا گیا مثلاً شمشیر الدولہ والد ملکہ زینت محل وغیرہ کو نیز انہوں نے کہا کہ وہ مجھے معزول کر کے میری جگہ مرزا مغل کو بادشاہ بنائیں گے---- افسران فوج یہاں تک سرچڑھ گئے تھے کہ ملکہ زینت محل (بادشاہ کی جواں سال بیگم) کا مطالبہ کرتے تھے کہ میں ان کو ان کے حوالے کر دوں"۔

"انہوں نے اس طرح بدوں میری مرضی یا خلاف حکم صرف میرے ملازموں ہی کو نہیں لوٹا بلکہ کئی محلوں کو لوٹ لیا۔ چوری کرنا، قتل کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا اور جو جو چاہتے کر گزرتے تھے-- جبراً" معزز اہل شہر سے اور تجار سے جتنی رقم چاہتے وصول کرتے تھے اور یہ مطالبات ذاتی اغراض کے لئے کرتے تھے۔ جو کچھ گزرا ہے وہ سب مفسدہ پرداز فوج کا کیا دھرا ہے میں ان کے قابو میں تھا اور کیا کر سکتا تھا وہ اچانک آ پڑے اور مجھے قیدی بنا لیا۔ میں لاچار تھا اور دہشت زدہ۔ جو انہوں نے کہا میں نے کیا ورنہ انہوں نے مجھے کبھی کا قتل کر ڈالا ہوتا۔ یہ سب کو معلوم ہے کہ مجھے ایسی مایوسی ہوئی تھی کہ زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا جبکہ میرے ماتحت عہدیداروں کو بھی جاں بری کی امید نہیں تھی اس لئے میں نے فقیری کا تہیہ کر لیا تھا اور گیروے رنگ کی صوفیانہ پوشاک پہننی شروع کر دی تھی۔ پہلے قطب صاحب کی درگاہ وہاں سے اجمیر شریف اور اجمیر شریف سے بالآخر مکہ معظمہ جانے کا عزم تھا۔ لیکن (باغی) فوج نے مجھے اجازت نہیں دی"۔

"یہ قابل غور ہے کہ کوئی شخص غریب ترین انسان کی عورت کا مطالبہ بھی یوں نہیں کرتا کہ لاؤ اسے مجھے دے دو میں قید کر دوں گا---- باغی فوج کی نسبت معلوم ہو کہ انہوں نے کبھی مجھے سلام تک نہیں کیا۔ نہ میرا کسی قسم کا ادب لحاظ کیا۔ وہ دیوان خاص و دیوان عام میں بے دھڑک جوتیاں پہنے چلے آتے تھے۔ (انہوں نے) مجھے مقید کر لیا مجھ پر جور کئے۔ مجھے حکم میں رکھا اور میرے نام سے فائدہ اٹھایا تاکہ میرے نام کی وجہ سے ان کے افعال مقبول ہوں"۔

"جب یہ فوجیں مفرور ہوئیں تو میں موقع پا کر چپ چاپ قلعے کے پھاٹک سے

نکلا اور مقبرہ ہمایوں میں جا کر ٹھہر گیا۔ اس جگہ سے میں طلب کیا گیا کہ میری جان محفوظ رہے گی اور میں نے فوراً" اپنے آپ کو لیفٹیننٹ گورنر کی حفاظت میں دے دیا۔ باغی فوجیں مجھے اپنے ہمراہ لے جانا چاہتی تھیں مگر میں نہ گیا"۔

اس عبارت کے بعد کتاب کے مرتب خواجہ حسن نظامی نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ "جس وقت افسران فوج نے بادشاہ کو لے جانے کا اصرار کیا میرے نانا وہاں موجود تھے۔" (4)

بہادر شاہ کی بے بسی

بہادر شاہ ظفر کا یہ بیان پڑھ کر اس امر میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہتا کہ وہ باغی فوجوں کی قید میں تھے۔ اکثر و بیشتر باغی انہیں سلام تک نہ کرتے تھے۔ ان کے دل میں بادشاہ کا مطلق احترام نہ تھا بلکہ اسے ذلیل کرتے تھے۔ ان کی جسارت کی انتہا یہ ہے کہ بادشاہ سے اس کی جواں سال بیگم (ملکہ زینت محل) کا مطالبہ کیا کہ اسے ہمارے حوالے کر دو۔ بقول بہادر شاہ ظفر معمولی سے معمولی آدمی سے بھی اس کی بیوی کو طلب کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جاتا۔ بادشاہ کے بیان کے مطابق باغی سپاہی لٹیرے بھی تھے اور نہ صرف اہل شہر کو لوٹ لیتے تھے بلکہ بادشاہ کے عہدیداروں کے محلات بھی لوٹ لیتے تھے۔ اہل شہر سے جبراً" روپیہ وصول کرتے تھے وہ بھی ذاتی مفاد کے لئے۔ اس کے نام سے فرمان جاری کرتے تھے۔ ایسا کمزور بادشاہ جو خود باغی فوجیوں کی قید میں ہو کسی انقلابی تحریک میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے۔

بہادر شاہ ظفر کے اس عدالتی بیان کے علاوہ بعض اور شہادتیں بھی اس امر کی موجود ہیں کہ باغی بادشاہ کو بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک مستند اور فاضل مورخ نے باغیوں کی زبان سے بادشاہ کی شان میں ایسے الفاظ درج کئے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ لوگ بادشاہ کے ساتھ حد درجہ گستاخی سے پیش آتے تھے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ یہ فاضل مورخ لکھتا ہے کہ:-

"شہر میں خلق خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم سپاہی بہادر کا" کی دہائی پھری۔ تلنگوں

کے غول بیابانی کی فرعونیت کا یہ حال تھا کہ ہر ایک ان میں کا فرعون بے سامان تھا جن کا
یہ قول تھا کہ "بھین ہم جلمنشی کے سر پر منڈا رکھ دئی وہی باس ساہو جائی"_ یعنی جس
شخص کے سر پر ہم اپنا جوتا رکھ دیں گے وہی بادشاہ ہو جائے گا۔ کوئی کہتا تھا "بڑھو سا سر
کے گولی مار دو اور دوسرے منشی کا باس سائی کر دی جائی"_ یعنی اس سسرے بوڑھے
بادشاہ کو گولی مار کر ختم کرو کسی اور کو بادشاہ بنالو۔ پس جس کل چاہا اس بگڑی ہوئی فوج
نے بادشاہ کو بٹھایا اور جس کروٹ چاہا لٹایا کیونکہ بادشاہ لاچار اور بے بس ان کے ہاتھ میں
پھنسے ہوئے تھے" (5)

یہ تھا باغیوں کی نظر میں بادشاہت کا وقار اور بادشاہ کی عزت۔ لاحول ولا قوۃ_
اگر اس قماش کے لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے تو سوچئے اس ملک کا کیا حشر
ہوتا۔

راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی نے اپنا ایک چشم دید واقعہ اپنی کتاب "داستان
غدر" میں بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "ایک دن کا اور ذکر ہے کہ صبح کا وقت ہے۔ دن
کے سات بجے ہیں۔ بادشاہ برآمد ہوئے اور دیوان خاص کے بیچ میں کرسی بچھوا کر بیٹھے
ہیں۔ کچھ تھوڑے سے آدمی (ملازمان شاہی) اس وقت موجود ہیں' کرسی کے پیچھے دو
خواص کھڑے مورچھل جھل رہے ہیں۔ میرے بہنوئی آغا سلطان کرسی کے قریب
کھڑے ہیں ان کے برابر میں ہوں اور کوئی چار پانچ آدمی ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پور
بیا فربہ اندام پستہ قد' ادھیڑ' پچاس پچپن برس کی عمر' منہ پر ڈاڑھی' گاڑھے کا کرتہ' دھوتی
بندھی ہوئی' سر پر ایک انگوچھا لپٹا ہوا' چندیا کھلی ہوئی' جال کرچ افسروں کی اس کے گلے
میں پڑی ہوئی عقب حمام کے چبوترہ کی طرف سے دربار میں آیا اور بادشاہ کو سلام کر کے
پاس چلا آیا۔ میرے بہنوئی نے روکا "ہیں ہیں کہاں چلے آتے ہو"_ مگر وہ کب سنتا تھا
پاس آکر بادشاہ کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا سنو بڑھو! ہم نے تمہیں باسا کیا۔" (6) (یعنی اے
بڈھے سن ہم نے تجھے بادشاہ بنایا ہے)۔
راقم الدولہ ظہیر دہلوی لکھتے ہیں کہ "یہ دیکھ کر ملازمین شاہی نے اس شخص کو
دھکے دے کر نکال دیا"_ آپ کو معلوم ہے کہ یہ کون بزرگ تھے؟ مولانا غلام رسول مہر

نے بھی اپنی کتاب "1857ء" کے صفحہ نمبر 118 پر یہ واقعہ بہت اختصار سے لکھا ہے یعنی
صرف 4 سطروں میں لیکن اس کے بعد کا حصہ حذف کر گئے اس لئے کہ بعد کے الفاظ
درج کرنے سے ان کے ایک ہیرو کی بدزیب تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی۔ ظہیر
دہلوی نے مصلحتوں سے بالا ہو کر کتاب لکھی اس لئے انہوں نے پورا واقعہ بے کم و
کاست بیان کر دیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ جب یہ پوریا چلا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ وہی بریلی
والا بخت خاں تھا۔ (7) یہ وہی صاحب ہیں جنہیں باغی فوجوں کا سپہ سالار اعظم اور ملک کا
گورنر جنرل بنایا گیا تھا۔

بہادر شاہ کی دماغی کیفیت

یہ تو تھا باغیوں کے ہاتھوں بہادر شاہ ظفر کی ذلت و رسوائی کا ایک اجمالی
خاکہ---- اب دیکھئے کہ بادشاہ عقل و خرد اور دماغی توانائیوں کے اعتبار سے کس منزل
میں تھے۔ خود مولانا غلام رسول مہر نے تسلیم کیا ہے کہ "اکبر شاہ ثانی (ہوں) یا بہادر شاہ
ثانی ____ (ان کے بارے میں) یہ ماننا چاہئے کہ ان بادشاہوں کی بے خیالی' بے حسی
اور بدلے ہوئے حالات سے بے خبری آخری منزل پر پہنچ چکی تھی اور وہ اس قابل نہ
رہے تھے کہ انجام کی دردناکی ہی نہیں بلکہ ہولناکی کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ (8)
بادشاہ (بہادر شاہ) اپنی عمر اور ضعف قویٰ کے باعث اس منصب کی ذمہ
داریوں کو پورا ہی نہ کر سکتا تھا جو اسے مل گیا تھا اور مغل شہزادوں میں ایک بھی صاحب
جوہر نہ تھا۔ بادشاہ ضعف کے علاوہ شہزادوں کے زور اور بیگم کے غلط مشوروں کے زیر
اثر دب گیا تھا' شہزادے اگرچہ ہر شے پر قبضہ کر لینے کے حریص تھے مگر حرص کے سوا ان
میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔
یہ تو بیان تھا مولانا غلام رسول مہر کا۔ اب ایک اور فاضل مولانا مناظر احسن
گیلانی کی رائے ملاحظہ فرمائیے جو نہ صرف اپنے دور کے بہت بڑے عالم' مورخ اور
سیرت نگار تھے بلکہ مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے خلیفہ بھی تھے۔ مولانا نے اپنی
کتاب "سوانح قاسمی" میں 1857ء کے واقعات کا بڑا حکیمانہ تجزیہ کیا ہے اور بعض

بصیرت افروز نتائج نکالے ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی دماغی کیفیت کے بارے میں سرسید کے ایک بیان کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"سب سے بڑے مرکز جسے فوجیوں نے سب سے بڑا مرکز بنا لیا تھا۔ یعنی دلی یہاں کا نظم و ضبط جس دل و دماغ کے سپرد کیا گیا تھا یعنی سراج الدین ظفر مرحوم ---- ان کے بارے میں سرسید احمد خاں کے یہ الفاظ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ بے بنیاد ہوں لکھتے ہیں":

(بہادر شاہ ظفر۔ ناقل) "ہمیشہ خیال کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کے ملکوں کی خبر لے آتا ہوں۔ اور اس بات کو اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے" ____ لوگ اس کے مرید ہوتے تھے۔ کسی فائدے کی نظر سے نہ بطور اعتقاد ---- کوئی ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا۔ اس کے منہ پر لوگ اس کی خوشامد کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔"(9)

اگر بغاوت کامیاب ہو جاتی تو کیا ہوتا؟

مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے حریت پسند مفکر و عالم کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انگریزوں کے ایجنٹ یا ان کے حامی تھے۔ انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے بارے میں سرسید کی یہ رائے قبول کی اور اس کی تائید کی۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 1857ء کے انقلاب کی باگ ڈور جس شخص کے ہاتھ میں دی گئی تھی یا جسے مرکزی شخصیت بنایا گیا تھا اس کی دماغی کیفیت کس درجہ قابل رحم تھی۔ وہ مراق اور مالی خولیا کا مریض تھا جسمانی اور دماغی دونوں قویٰ نہایت کمزور تھے دل سے انگریزوں کا حامی اور باغیوں کے اس اقدام کا مخالف تھا شہزادے اور ملکہ اس پر حاوی تھے سپاہیوں کی قید میں تھا۔ سپاہی اسے ذلیل کرتے تھے۔ قارئین خود نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایسا شخص اتنی بڑی بغاوت کی قیادت کرنے کا اہل تھا؟ اگر بالفرض یہ بغاوت کامیاب ہو جاتی تو اس قسم کا بادشاہ کتنے دن ملک کا نظم و نسق چلاتا اور ملک کا کیا حشر ہوتا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کیا ضروری تھا کہ بہادر شاہ ظفر ہی کو ساری عمر مسلط رکھا جاتا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے

اپنے تاریخی اور حکیمانہ تجزیہ سے اس امکان کی بھی دھجیاں بکھیر دیں مولانا لکھتے ہیں:۔

"انگریز کی مسلط شدہ حکومت کو ختم کر دینے یا الٹ پلٹ کر دینے کے بعد اس کی از سر نو تشکیل کے اسباب اور سامان موجود نہ تھے اور ان سے اس زمانے کا ماحول خالی اور مفلس نظر آ رہا تھا۔ اس زمانے میں ملک کا جو حال تھا' عوام و خواص جس رنگ میں رنگین تھے اس کا حکیمانہ بصیرت کے ساتھ جس نے بھی مطالعہ کیا ہے وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ بہادر بادشاہ اور اس عہد کے دوسرے حکمرانوں کی قیادت اتنی بے جان تھی کہ کسی بہتر نتیجے کی توقع نہ کی جا سکتی تھی۔"(10)

علامہ فضل حق کا تبصرہ

مولانا مناظر احسن گیلانی اس واقعے کے بہت بعد کے بزرگ تھے اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا تجزیہ محض قیاس پر مبنی ہے لیکن علامہ فضل حق خیر آبادی کی رائے کو کون غلط قرار دے سکتا ہے جو اس وقت دلی میں موجود تھے اور بعض روایات کے مطابق باغیوں کے شریک کار تھے۔ اسی جرم میں انہیں عبور دریائے شور (کالا پانی) کی سزا ملی۔ مولانا نے جزائر انڈمان میں اپنی اسیری کے دوران ایک کتاب "الثورة الہندیہ" کے نام سے لکھی جو 1857ء کی بغاوت کے احوال و کوائف پر مشتمل ہے۔ اپنی اس گراں قدر تصنیف میں علامہ فضل حق خیر آبادی نے اس بغاوت کے سربراہ بادشاہ ظفر' ان کے حواریوں اور فوجی سرداروں کی ذہنی و انتظامی صلاحیتوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے مولانا مناظر احسن گیلانی کے تجزیہ کی پوری تائید ہوتی ہے۔ علامہ فضل حق فرماتے ہیں:۔

"بادشاہ کی رائے نہایت کمزور تھی' بوڑھا تھا اور نیک و بد میں تمیز کرنے سے قاصر تھا۔ اپنی شریک حیات اور وزیر کا تابع فرمان تھا۔ شہزادے خود رائے تھے جنہوں نے نہ کبھی تلوار اٹھائی نہ میدان جنگ کا منہ دیکھا۔ بازاری لوگ ان کے ساتھی تھے جن کے ہمراہ یہ لوگ عیش و عشرت' اسراف اور فسق و فجور میں مبتلا رہتے تھے۔ ان ہی میں سے ایک شہزادے کو فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تھا۔ یہ کمانڈر انچیف عاقبت نا اندیش'

عقل سے خارج' خیانت اور بزدلی کی مذموم صفات ـ کے علاوہ ہر چیز سے محروم تھا۔ جو فوج میرٹھ سے آئی تھی وہ بہت سے گروہوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ان میں بعض گروہ تو ایسے تھے جن کا سرے سے کوئی سردار ہی نہ تھا۔ بعض کھانے اور سر چھپانے کی سہولت سے بھی محروم تھے اس لئے کمزوری کا شکار تھے ایک طبقہ فوج کا ایسا تھا جس کے ہاتھ شروع میں جو مال غنیمت آیا اسی پر قبضہ کر کے مطمئن ہو بیٹھا ایک گروہ فوج کا ایسا تھا جو بہادری سے لڑتا رہا۔ مغربی علاقے کے ہندو مال و دولت اور آدمیوں کے ذریعے انگریزوں کی امداد کر رہے تھے۔ دہلی کے ہندو شہریوں کی اکثریت انگریزوں کی حامی تھی۔ شہر کے مسلمانوں میں بھی دو گروہ ہو گئے تھے ایک تو انگریزوں کا دشمن اور دوسرا ان کی محبت میں اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ باغی لشکروں کو زک دینے اور مجاہدین کو ذلیل و ناکام کرنے میں اس نے کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔" (11)

یہ تھی حالت اس بغاوت کے سربراہ' اس کے مشیروں' شہزادوں' فوج' فوج کے سرداروں اور دہلی کے شہریوں کی جس کی نشاندہی انگریزوں کا کوئی حامی یا ایجنٹ نہیں بلکہ ان کا سخت ترین دشمن کر رہا ہے۔ اس قسم کی فوج' اس کے سرداروں اور سربراہ سے کسی بھی بھلائی اور فتح مندی کی کیا توقع کی جا سکتی تھی اور کیا ایسے شہری کسی کامیابی کا منہ دیکھ سکتے تھے؟

گئوکشی کی سزا پھانسی

اس بغاوت کا ایک پہلو اور بھی افسوسناک اور بے حد افسوسناک ہے۔ بہ حیثیت مجموعی اس بغاوت پر ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ باغیوں میں ہندو سپاہیوں کی کثرت تھی۔ یہ لوگ اس حد تک متعصب تھے کہ گائے تو گائے بیل کو بھی مقدس سمجھتے تھے اور باربرداری کا کام بیل سے لینا ہندومت کی توہین خیال کرتے تھے۔ بادشاہ شہزادے اور باغی فوج کے مسلمان سردار بھی اس ہندو گردی کے ہاتھوں بے بس تھے۔ چنانچہ اس بغاوت کو جہاد آزادی قرار دینے والے سب سے بڑے مورخ مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں:۔

(باغی) "سپاہیوں میں کثرت ہندوؤں کی تھی۔ شہر کی آبادی میں بھی انہی کا

تناسب زیادہ تھا۔۔۔۔ 9 جولائی کو ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا کہ جو شخص گائے ذبح کرے گا اسے پھانسی دے دی جائے گی۔ پھر تلنگوں نے حکم جاری کرایا کہ حلال خور (چوہڑے) کوڑا کرکٹ بیلوں پر نہیں بلکہ گدھوں پر لادا کریں"۔(12)

اندازہ فرمائیے کہ ابھی انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ صرف چند شہر باغیوں کے قبضے میں آئے تھے' دہلی دوبارہ انگریزی فوجوں کی زد میں تھا اس کے باوجود ہندوؤں کے عزائم یہ تھے کہ گائے ذبح کرنے پر پھانسی کی سزا مقرر کر دی گئی تھی اور بیل پر کوڑا کرکٹ لادنا خلاف قانون قرار دیا گیا تھا۔ اگر ان گئو پرستوں کی حکومت مستحکم ہو جاتی تو مسلمانوں کو کن مصائب سے دوچار ہونا پڑتا؟ اور پھر ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہوتا۔

اعلان جہاد اور انجام

مہر صاحب لکھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد دلی کے مولوی محمد سعید صاحب نے جامع مسجد میں محمدی جھنڈا کھڑا کر دیا۔ بادشاہ کو اطلاع ملی تو مولوی صاحب کو بلا کر دریافت کیا گیا کہ انگریز تو رہے نہیں پھر یہ جھنڈا کس کے خلاف ہے یہ کیا حماقت ہے۔ سپاہیوں میں زیادہ تر پوربیئے ہندو ہیں اس طرح ان سے لڑائی شروع ہو جائے گی۔ بعض لوگوں نے کہا کہ (شہر کے) ہندوؤں کا میلان انگریزوں کی طرف ہے اور مسلمانوں سے قطعاً" ہمدردی نہیں۔۔۔۔۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح شبہات بڑھتے گئے اور آخری دور میں شہر کے ہندوؤں کا میلان انگریزوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔۔۔۔۔ پھر بخت خاں نے آکر (جہاد کے) فتوے کا انتظام کیا تو مسلمان بہت تیز اور مشتعل ہو گئے۔۔۔۔

جہاد کے فتوے اور جہادیوں کا انجام کیا ہوا اس کی روداد بھی مولانا غلام رسول مہر سے سنیئے۔ مولانا ذکاء اللہ دہلوی کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ "جہاد کا فتویٰ شائع ہوا تو دیکھا گیا کہ اکثر جہادی بھوکے مرتے تھے۔ ان کے بدن پر کپڑے بھی ثابت نہ تھے مگر بغل میں تلوار یا خنجر یا کندھے پر توڑے دار بندوق ضرور تھی۔ بادشاہ نے انتظام کرا دیا کہ اہل شہر خیرات کی روٹیاں کھلایا کریں۔ نواب بڈھے صاحب نے انہیں دو ہزار روپے دیئے۔ دہلی کے نامور مصور محمد شریف نے سارے گھر کا اسباب اور مکان خیرات

میں دے دیئے خود بھی جہادیوں میں شریک ہوا۔ پھر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی بھی آئے تھے اور قلعے کے پاس مولوی محمد حیات کی مسجد میں اترے تھے۔ جب دیکھا کہ جہاد کی صورت اچھی نہیں تو چلے گئے" (13)

ظاہر ہے کہ جس جنگ اور بغاوت میں ہندو غالب ہوں وہاں جہاد کا فتویٰ کیسے موثر ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ کی طرف سے جہادیوں کی قطعاً" سرپرستی نہیں کی گئی۔ اگر کی گئی تو اتنی کہ اہل شہر کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ خیرات کی روٹیاں ان غریب جہادیوں کو دے دیا کریں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ جہاد جیسے مقدس فریضے اور اس کا علم اٹھانے والوں کی ایسی ہتک دنیا کے پردے پر کسی اسلامی شہر میں اور وہ بھی مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے شاید ہی ہوئی ہو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ خود اہل شہر فتویٰ جہاد اور جہادیوں سے کوئی ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ ورنہ ان کا یہ حسرتناک انجام نہ ہوتا جسے دیکھ کر مولانا رحمت اللہ کیرانوی جیسا عالم بھی بددل ہو کر چلا گیا۔

یہ تھے وہ اسباب جن کے پیش نظر سرسید احمد خان اور ان کے بعض معاصرین نے 1857ء کی بغاوت کی مخالفت کی اسے مفسدہ اور فتنہ آرائی قرار دیا اور انگریزوں کی حمایت ہی میں ملت کی فلاح سمجھی کیونکہ ان کے سامنے بغاوت کے ہولناک نتائج کی تصویر آ چکی تھی۔

ہم نے اس باب کی ابتدا میں عرض کیا تھا کہ کسی انقلاب کی کامیابی کی جو پانچ شرائط ہوتی ہیں ان میں اول شرط مرکزی شخصیت کا وجود ہوتا ہے' دوسری شرط کے تحت اس مرکزی شخصیت کو جسمانی اور دماغی لحاظ سے توانا ہونا چاہئے' انقلاب میں شریک افراد اس سے محبت کرتے ہوں اور اس کے احکام کی دل وجاں سے تعمیل کرتے ہوں۔ سطور بالا سے ثابت ہو گیا کہ 1857ء کی بغاوت میں یہ دونوں شرائط عنقا تھیں۔ اب تیسری شرط کی طرف آیئے۔

بغاوت میں شامل افراد کا نصب العین

کسی انقلاب کی کامیابی کی تیسری شرط یہ ہوتی ہے کہ اس میں شامل افراد کے

سامنے ذاتی مفادات نہ ہوں بلکہ بلند ملکی اور قومی نصب العین ہو۔ آیئے دیکھیں کہ 1857ء کی بغاوت میں شامل شخصیتوں کے پیش نظر کیا نصب العین تھا۔

اس بغاوت کے اصل بانی وہ فوجی تھے جنہیں شکایت تھی کہ انہیں ایسے کارتوس دیئے گئے ہیں جن پر چربی لگی ہوئی ہے اور بندوقوں میں رکھنے سے پہلے انہیں دانتوں سے کاٹنا پڑتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ چربی گائے اور سور کی ہے جس کو منہ لگانے سے ان کا دین برباد ہو جائے گا۔ اس کا مطلب ہوا کہ اگر انگریز یہ کارتوس واپس لے لیتے تو سپاہی بغاوت نہ کرتے اور انگریزوں کی غلامی پر رضامند ہو جاتے۔ کیا یہ کوئی بلند نصب العین قرار دیا جا سکتا ہے کہ ایک شکایت رفع ہو جانے کے بعد شکایت کرنے والے پھر اپنے آقاؤں کی غلامی اختیار کر لیں۔

دیسی فوجیوں کے پیش نظر کچھ اور مقاصد بھی تھے جن پر مولانا غلام رسول مہر نے کسی قدر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے مثلاً۔

(1) 1764ء میں میر جعفر نے گوروں کو بہت بڑی رقم دی۔ جب یہ رقم تقسیم کی گئی تو ہر گورے سپاہی کے حصے میں چالیس روپے آئے اور دیسی سپاہی کے حصے میں صرف چھ روپے۔ اس پر دیسی سپاہیوں نے احتجاج کیا۔ آخر بڑی ردوکد کے بعد دیسی سپاہیوں کا حصہ بڑھا کر چھ روپے سے بیس روپے کر دیا گیا۔ (14) (ملخص) بلاشبہ کالے اور گورے میں یہ تفریق صریح ناانصافی اور ظلم تھا۔

(2) گورے جب کسی جنگی مہم پر روانہ ہوتے تھے تو وہ اپنا سامان خود نہیں اٹھاتے تھے۔ دیسی سپاہیوں کو یہ سامان خود اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ بوجھ اتنا ہوتا تھا کہ سپاہیوں کے جسم اس طویل سفر میں اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر سامان اٹھانے کے لئے بیل گاڑیوں یا خچروں کا انتظام کرتے تو اس کا خرچ انہیں خود برداشت کرنا پڑتا جو ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ (15) (ملخص) اس امتیاز کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے لیکن اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر انگریز افسر گوروں اور دیسی سپاہیوں دونوں کو ایک جیسی رقم دے دیتے اور گورے اور کالے کی اجرت میں فرق روا نہ رکھتے تو دیسی سپاہی انہیں دعائیں دیتے اور ساری عمر خوشی سے ان کی غلامی کرتے۔

اگر گوروں کی طرح دیسی سپاہیوں کو بھی اپنا سامان خود اٹھانے کی بجائے بیل گاڑیاں یا خچر مہیا کر دیئے جاتے تو وہ خوشی خوشی انگریز جرنیلوں کی کمان میں مارچ کرتے اور اپنے ہم وطنوں پر گولیاں چلاتے جن پر انہوں نے ساری عمر گولیاں چلائیں۔ کیا یہ کوئی بلند نصب العین تھا یا محض ذاتی مفاد؟

بغاوت میں شامل افراد کے سامنے بعض اور نصب العین بھی تھے ان کی بھی مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب میں نشاندہی کی ہے کہ مثلاً:۔

(3) باجی راؤ پیشوا ثانی جو مرہٹوں کا آخری پیشوا تھا 1817ء میں انگریزوں سے شکست کھانے کے بعد کانپور کے قریب بھٹور نامی مقام پر مقیم ہو گیا۔ انگریزوں نے اس کے لئے آٹھ لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کر دی۔ انتقال سے پہلے اس نے ڈھوندو پنت عرف نانا صاحب کو اپنا جانشین بنایا تھا اور اسے اپنا وارث قرار دیا تھا۔ نانا صاحب کا خیال تھا کہ باجی راؤ کی پنشن اسے ملے گی مگر انگریزوں نے یہ پنشن اسے نہ دی (حالانکہ یہ سراسر ناانصافی اور بدعہدی تھی۔ مولف) نانا صاحب نے پنشن کے حصول کے لئے قانونی کارروائی کی حتیٰ کہ لندن تک وکیل بھیجے مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس واقعے کے بعد نانا صاحب انگریزوں کا دشمن ہو گیا۔ کانپور میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کا وہی سرغنہ تھا اور اس نے بہت سے انگریزوں کے بچوں اور عورتوں کو پناہ دینے کے بعد جب وہ کشتیوں میں سوار ہوئے تو گولیوں کی بوچھاڑ مار کر سب کو فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ (بعض مورخوں نے تانتیا ٹوپی کو اس واقعے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ مولف

(4) جن لوگوں کے ہاتھ میں چھوٹے بڑے علاقوں کی حکومت تھی یا جنہیں بڑی بڑی پنشنیں ملتی تھیں انہیں جواب مل گیا۔ بہت سے ہندوستانی عہدیداروں کو زمینیں دی گئی تھیں۔ اصطلاح میں انہیں "انعام" کہا جاتا تھا۔ ان 35 ہزار جاگیروں میں سے انگریزوں نے کم و بیش 21 ہزار ضبط کر لیں۔ ان لوگوں کا انگریزوں سے بدظن ہو جانا قدرتی امر تھا۔ (16) (ملخص)۔

آپ نے اندازہ فرمایا کہ اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کے سامنے کیا مقاصد تھے۔ اگر نانا صاحب کو باجی راؤ پیشوا کی پنشن 8 لاکھ روپے سالانہ ملتی رہتی تو وہ بدستور

انگریزوں کا وفادار رہتا اور کانپور کا خونیں ڈرامہ جو رونما ہوا کبھی رونما نہ ہوتا۔ جن جاگیرداروں کی جاگیریں انگریزوں نے ضبط کر لیں اور جو تعداد میں 21 ہزار کے قریب تھیں اگر وہ انگریز ضبط نہ کرتے تو وہ اپنے ان سفید فام آقاؤں کے خلاف کبھی بغاوت نہ کرتے اور بدستور ان کی غلامی کرتے رہتے۔ کیا ان مقاصد کو قومی یا ملی مقاصد قرار دیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ کوئی بلند نصب العین کہلا سکتا ہے؟ گویا یہ جنگ آزادی نہیں جنگ زرگری تھی۔ مولانا غلام رسول مہر اور ان کے ہم نوا واقعات کی جو تصویر پیش کرتے ہیں اس سے تو یہی نتیجہ سامنے آتا ہے۔

آخری اور سب سے بڑی وجہ جو اس بغاوت کی پیش کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انگریز حکام کے اشارے پر پادری ہندوستانی فوجیوں اور سرکاری ملازموں کو جمع کرتے اور ان کے سامنے عیسائیت کی تبلیغ کرتے اور اپنے مذہب کو ہندومت اور اسلام سے بہتر اور افضل ثابت کرتے۔

بلاشبہ یہ ایک شرمناک حرکت تھی اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے لیکن کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر انگریز اپنے پادریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کی اجازت نہ دیتے اور انہیں اس اقدام سے روک دیتے تو دیسی سپاہی انگریزوں کے خلاف باغیانہ قدم نہ اٹھاتے اور ان کی غلامی کا جوا اپنے کندھے پر رکھ کر اسے کھینچتے رہتے۔

یہ ہے ایک سرسری خاکہ اس بغاوت میں حصہ لینے والوں کے نصب العین کا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باغیوں کے پیش نظر ہرگز کوئی بلند نصب العین نہ تھا۔ دیسی سپاہی گوروں کے برابر اجرت طلب کرتے تھے۔ جن جاگیرداروں کی جاگیریں اور پنشنیں ضبط ہو گئی تھیں وہ اپنی حق تلفی پر ناراض تھے۔ جن نوابوں یا راجاؤں کو ان کی نیم خودمختارانہ ریاستوں سے محروم کر دیا گیا تھا انہیں اپنا اقتدار چھن جانے کا غم تھا حالانکہ یہ اقتدار برائے نام تھا اور انگریزوں کی سرپرستی میں قائم تھا۔ کیا کوئی صحیح الدماغ اور راست فکر شخص ان مقاصد کو بلند اور قومی و ملی مقاصد قرار دے سکتا ہے؟

باہمی روابط اور نظم وضبط کا فقدان

کسی انقلاب کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ انقلابیوں کے درمیان مکمل

ربط ہو' ان میں نظم و ضبط موجود ہو' ان کے سامنے ایک منصوبہ ہو۔ اگر یہ شرائط موجود نہ ہوں تو وہ انقلاب نہیں ایک ہنگامہ ہے جس کا نتیجہ تباہی کے سوائے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ آیئے اس نقطہ نگاہ سے 1857ء کی بغاوت کا جائزہ لیں۔ اس موضوع پر ہمارے عہد کے مشہور مورخ' عالم اور ماہر تعلیم پروفیسر مولانا علم الدین سالک مرحوم نے ایک مقالہ لکھا تھا۔ پروفیسر سالک مرحوم 1857ء کے "مجاہدین" اور ان کے مقاصد کے بہت بڑے حامی تھے۔ مرحوم نے اس بغاوت میں شریک افراد کو جی بھر کے خراج تحسین پیش کیا مگر ایک غیر جانبدار مورخ کی حیثیت سے انہوں نے معاملے کے دوسرے پہلو پر بھی اظہار خیال کیا۔ مولانا فرماتے ہیں:۔

"انقلابیوں میں جہان بھر کی خوبیاں تھیں لیکن حق تو یہ ہے کہ آزادی پسند مجاہدین کے پاس پہلے سے سوچا ہوا کوئی منصوبہ نہ تھا جس کی روشنی میں وہ آزادی کی جنگ لڑتے۔ میرٹھ کی چھاؤنی میں 11 مئی کو ہنگامہ برپا ہوا مگر فوجوں اور ان کے سردار کو یہ معلوم نہ تھا کہ اس ہنگامے کے بعد انہیں کیا کرنا ہے۔ چنانچہ جونہی سپاہیوں میں کسی بے فکرے نے "دہلی چلو" کا نعرہ بلند کیا تو یہ ساری فوج چھاؤنی انگریزوں کے حوالے کر کے خود عازم دہلی ہو گئی اس قسم کی غلطیاں ہر مقام پر ہوئیں۔ اسی غیر مآل اندیشانہ اقدام کا یہ اثر ہوا کہ انگریزوں کو اپنی منتشر قوتوں کو یک جا کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے چھوٹے چھوٹے محاذوں پر قبضہ کرنے کے بعد مجاہدین کے مرکز (دہلی) پر ہلہ بول دیا۔

دوسری جانب دہلی کی یہ حالت تھی کہ وہاں کسی کو اس بات کا علم تک بھی نہ تھا کہ میرٹھ اور دیگر مقامات پر کیا ہو رہا ہے۔ بادشاہ کی عمر 87 برس کی تھی اسے جہانداری و جہانگیری' نظم و نسق' لشکر کشی اور معرکہ آرائی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ فوج خود سر اور بے قابو تھی اسے سنبھالنا بڑا مشکل کام تھا اور اس وقت کوئی ایسا آدمی موجود نہ تھا جو فوج کو قابو میں رکھ سکتا۔ مرزا مغل جیسے ناتجربہ کار شہزادے کو سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ فوج نے پروا تک نہ کی جو چاہا کیا۔ اس سے بڑھ کر خطرناک صورتحال یہ تھی کہ شہزادے اور فوجی سردار اتحاد عمل کی دولت سے بالکل بے مایہ تھے۔ وہ نفاق اور حسد کا شکار تھے ___ ملک کے مختلف علاقوں میں لڑنے والے فوجیوں میں کسی قسم کا اتحاد عمل اور باہمی رابطہ نہ

تھا۔ ملک کے مختلف مقامات پر جہاں بھی انگریزی فوج تھی وہ ایک تنظیم کے ماتحت تھی اس کے حکم کے مطابق عمل کرتی۔ اس کے برخلاف "مجاہدین" میں یہ جوہر سرے سے مفقود تھا۔ انگریز کی دشمنی میں سب شریک تھے وہ اسی جذبے کے ماتحت عارضی طور پر اکٹھے ہو جاتے۔ جب حالات بدل جاتے تو یہ تنظیم بھی ختم ہو جاتی" (17)

مضمون کو طول دینا مقصود نہیں یہی رائے ان تمام مورخین کی ہے جنہوں نے 1857ء کی بغاوت کا غیر جانبدارانہ تجزیہ کیا ہے۔ البتہ پروفیسر علم الدین سالک مرحوم نے دوسرے مورخین سے ہٹ کر ایک حقیقت افروز نکتہ بیان کر دیا ہے کہ انگریز کی دشمنی میں باغی عارضی طور پر اکٹھے ہو گئے تھے۔ اگر حالات بدل جاتے یہ اجتماع بھی ختم ہو جاتا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پھر کیا ہوتا؟ لامتناہی تباہی' بربادی' ذلت' رسوائی۔ سرسید احمد خاں اور ان کے معاصرین تو اسی دور کے بزرگ تھے۔ ہمارے عہد کے مورخوں سے کہیں بہتر وہ حالات کو سمجھتے اور ان پر نظر رکھتے تھے۔ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اہل وطن خصوصاً" مسلمانوں کو اس بغاوت میں حصہ نہ لینے کا مشورہ دے کر قوم پر احسان کیا۔ اگر ان کی بات مان لی جاتی تو مسلمانوں کو جس عبرتناک انجام سے دوچار ہونا پڑا یقیناً وہ اس سے محفوظ رہتے۔

بغاوت کا دائرہ

ہمارے بعض مورخوں نے 1857ء کی بغاوت کی ہمہ گیری یا ملک گیری ثابت کرنے کے لئے مفروضات کا سہارا لیا اور خود ساختہ نظریات پیش کر کے واقعات کی غلط تصویر دکھائی۔ ہم ان کی دیانت پر شبہ نہیں کرتے انہیں ایک شوق تھا کہ اس ہنگامے کو جہاد آزادی بنا دو۔ اس شوق میں انہوں نے وہ سب کچھ کیا جو اس شوق کی تکمیل کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ افسوس کہ اس طرح تاریخ مسخ ہو کر رہ گئی۔ مثال کے طور پر ہمارے ایک قابل احترام مورخ نے 1857ء کی بغاوت کے دائرہ کو وسیع کر کے سارے ملک پر پھیلا دیا ہے انہوں نے بغاوت زدہ شہروں کی تقسیم یوں کی ہے۔

آگرہ ڈویژن اور میرٹھ ڈویژن' روہیلکھنڈ اور فرخ آباد۔ بنارس ڈویژن اور الہ

آباد ڈویژن، کانپور، اودھ، بنگال، بہار، اڑیسہ، وسط ہند اور راجپوتانہ، پنجاب و سرحد۔
اس طرح مورخ موصوف نے پشاور سے لے کر کلکتہ تک اور جنوب میں سی پی تک سارے ہندوستان کو بغاوت کی لپیٹ میں لے لیا۔ کیا یہ واقعات کی صحیح تصویر ہے؟ حقیقت میں ایسا نہیں۔

بغاوت میرٹھ سے شروع ہوئی مگر دیسی فوج نے میرٹھ پر قبضہ کیا ہی نہیں بلکہ وہاں سے دہلی چلی گئی میرٹھ آخر تک انگریزوں کے قبضے میں رہا۔ اسی طرح سہارنپور اور اٹاوہ پر بدستور انگریزوں کا کنٹرول رہا۔ دہلی، آگرہ ڈویژن، روہیلکھنڈ، بنارس، کانپور، الہ آباد، اودھ، جھانسی (سی پی میں) گوالیار، باندہ، کالپی، نصیر آباد، نیمچ، اندور اور نوگاؤں یہ تھے وہ ڈویژن اور شہر جہاں بغاوت ہوئی اور باغی فوجوں نے ان شہروں پر قبضہ کر لیا۔
گویا دہلی یوپی اور سی پی کے چند شہر اس بغاوت کی لپیٹ میں آئے۔ لیکن کیا ہندوستان صرف انہی شہروں تک محدود تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ پورا پنجاب، پورا صوبہ سرحد، پورا سندھ، پورا بلوچستان، پورا صوبہ بمبئی، پورا صوبہ مدراس، پورا صوبہ اڑیسہ، پورا صوبہ بہار، پورا صوبہ بنگال اور پورا صوبہ آسام اس بغاوت سے لاتعلق رہے۔ مولانا مہر نے پنجاب اور سرحد میں بغاوت رونما ہونے کی جو تصویر دکھائی ہے وہ خلاف واقعہ ہے اس میں شک نہیں کہ انبالہ، فیروزپور، شملہ، لدھیانہ، جالندھر، ہوشیار پور، کانگڑہ، لاہور، امرتسر، گوجرانوالہ، گورداسپور، سیالکوٹ، جہلم، لیہ، ملتان، ساہیوال، مردان، پشاور اور حیدر آباد (سندھ) میں بعض واقعات رونما ہوئے۔ یعنی ان شہروں میں سے بعض میں بے چینی کے محض آثار ظاہر ہوئے وہ بھی صرف چھاؤنیوں تک۔ بعض میں بے چینی کا اظہار بھی ہوا اور بعض میں بغاوت بھی رونما ہوئی لیکن صرف ہندوستانی سپاہیوں کی طرف سے وہ بھی چھاؤنیوں تک محدود رہی اور بری طرح ناکام ہوئی۔ شہروں میں امن و امان رہا۔

پنجاب و سندھ میں بغاوت کی حقیقت

یہاں مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ گویا پنجاب، سندھ اور صوبہ سرحد بھی بغاوت

میں شریک تھے لیکن اس حقیقت کی طرف غور نہیں کیا جاتا کہ یہ بغاوت کس نے کی؟ خود مولانا غلام رسول مہر نے اعتراف کیا ہے کہ یہ سارے باغی اردو بولنے والے پوربیے تھے۔ چنانچہ مولانا کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"رنجیت سنگھ کے بعد جو دور شروع ہوا تھا وہ تو حقیقتاً یہاں کے باشندوں کے لئے ایک عذاب الیم تھا انگریزوں نے اس عذاب الیم سے لوگوں کو نجات دلائی لہٰذا وہ انگریزی حکومت کے متعلق اس رائے کے حامی نہ ہو سکتے تھے جس پر ملک کے دوسرے حصوں کی بعض آبادیوں نے عمل کیا۔۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ پنجاب میں جہاں جہاں ہنگامے بپا ہوئے وہ پنجابیوں نے نہیں بلکہ ہندوستانیوں نے بپا کئے تھے۔ پنجابیوں نے تو ایک سے زیادہ مواقع پر درخواست کی تھی کہ انہیں ہندوستانی فوجیوں سے الگ رکھا جائے" (18)

حقیقت بھی یہی ہے کہ پنجاب میں جہاں بھی بغاوت ہوئی اس کا دائرہ صرف چھاؤنیوں اور ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت تک محدود رہا اور انگریزوں نے اسی وقت وفادار پنجابی اور پٹھان فوجوں کی مدد سے ہر بغاوت کو چند گھنٹوں میں فرو کر دیا۔ باغیوں میں سے بعض کو توپ سے اڑا دیا گیا، بعض کا تعاقب کر کے ختم کر دیا گیا۔ پنجاب، سندھ یا صوبہ سرحد میں کسی ایک شہر کے عوام الناس یا سرکردہ لوگوں نے بغاوت میں قطعاً حصہ نہیں لیا۔ صرف دو مثالیں ہیں، ایک مثال ساہیوال کے احمد خاں کھرل کی جس نے بڑی بے جگری سے انگریزوں کا مقابلہ کیا اور مردانہ وار اپنی جان قربان کر دی مگر اس احمد خاں کھرل کا ساتھ بھی اس کے قبیلے کے علاوہ صرف جوئیا خاندان اور وٹو قبیلے نے دیا۔ ساہیوال یا دوسرے اضلاع کے عوام و خواص اس سے لاتعلق رہے۔ بعض نے تو سخت مخالفت کی اور انگریزوں کی امداد کر کے احمد خاں کو شکست سے دوچار کیا بلکہ درگاہ موسیٰ پاک شہید کے سجادہ نشین مخدوم شیخ عبدالقادر تین سو سوار لے کر احمد خاں کھرل کے مقابلے پر تشریف لے گئے اور انگریزوں کی معیت میں اس سے جنگ لڑی۔ (19)

دوسری مثال لدھیانہ کی ہے جہاں شورش برپا ہوئی اور ایک عالم مولوی عبدالقادر صاحب لدھیانوی کی کوشش سے لدھیانہ، جالندھر اور پھلور میں مقیم پلٹنوں

نے بغاوت کی۔ یہ پلٹنیں بھی ہندوستانی تھیں۔ ان باغیوں نے جیل خانہ توڑ دیا' انگریزوں کے مکان جلا دیئے' سرکاری خزانہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جالندھر' لدھیانہ اور پھلور کی فوج مل کر "آزادی" کی اس جنگ میں حصہ لینے کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہو گئی۔ (20)

گویا یہ ساری کارروائی ہندوستانی فوج اور مولوی عبدالقادر لدھیانوی کے چند عقیدت مندوں نے کی مگر اس ہنگامے کے بعد باغی فوجیں دہلی چلی گئیں اور لدھیانہ پر قبضہ نہ کر سکیں بلکہ اسے انگریزوں کے لئے چھوڑ گئیں۔ اگر لدھیانہ' جالندھر اور پھلور کے عوام و خواص اس بغاوت میں شریک ہوتے تو ان تینوں شہروں پر ان کا قبضہ ہو جاتا مگر ایسا نہ ہوا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اقدام ہندوستانی فوجیوں نے کیا اور مولوی عبدالقادر لدھیانوی کی تحریک اور مشوروں سے کیا۔ مقامی آبادی نے اس میں قطعاً" حصہ نہیں لیا۔ اسی طرح حیدر آباد سندھ میں بے چینی کے آثار ظاہر ہوئے مگر وہاں بھی حالات پر قابو پا لیا گیا۔ اس سلسلے میں سندھ کے انگریز حکام نے اس بے چینی سے متعلق جو خطوط وقتاً" فوقتاً" اپنے افسروں کو لکھے وہ سندھ ریکارڈ آفس کراچی میں محفوظ ہیں۔ ان خطوط اور مراسلوں کا ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری نے اپنی معلومات افزا کتاب "جنگ آزادی 1857ء" میں درج کیا ہے۔ اس ریکارڈ کی رو سے حیدر آباد (سندھ) میں متعین رجمنٹ میں خفیہ میٹنگیں ہوئیں اور ان دیسی سپاہیوں نے فیصلہ کیا کہ بندوقوں پر قبضہ کر لیا جائے' انگریزوں کو قتل کر دیا جائے' خزانہ لوٹ لیا جائے' بنگلوں کو آگ لگا دی جائے اور قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس باغیانہ منصوبے کی خبر ایک دیسی افسر (صوبے دار میجر) نے دی انگریز افسر چوکنے ہو گئے۔ سندھ پولیس کے مضبوط دستے نے انگریز افسروں کی امداد کی اور دیسی سپاہیوں سے ہتھیار لے کر انہیں بے بس کر دیا۔ اسی طرح کے اکا دکا واقعات پیش آئے مگر کسی ایک شہر یا قصبے میں بغاوت نہیں ہوئی۔ 13 ستمبر 1857ء کے مراسلے میں سی پی ڈاؤن مجسٹریٹ حیدر آباد نے سندھ پولیس اور دیہات کے سندھی جوانوں کو خراج تحسین پیش کیا ہے جنہوں نے سرکار سے وفاداری کا ثبوت دیا۔ (21)

غرض یہ کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان میں مکمل امن و امان رہا اور عوام و خواص انگریزوں کی وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ پھر ہندوستان کی ریاستیں مثلاً حیدر آباد دکن' میسور' جے پور' جودھپور' بھوپال' ٹونک' رامپور' کشمیر' پٹیالہ' جیند' نابھہ' مالیر کوٹلہ' بہاولپور اور خیر پور مکمل طور پر انگریزوں کی وفادار رہیں۔ پنجابی خصوصاً" سکھ اور پٹھان فوجیں نہ صرف انگریزوں کی طرف سے لڑیں بلکہ دلی اور دوسرے بغاوت زدہ شہروں کی بربادی میں دل کھول کر حصہ لیا اور اپنے آقاؤں سے بھی آگے نکل گئیں۔

ان کوائف کی روشنی میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ 1857ء کی بغاوت کا دائرہ کس حد تک وسیع تھا؟ اور انگریزوں کو بے اعتمادی نہ پنجابی اور پٹھان فوجوں پر تھی نہ مدراس اور بنگال کی فوجوں پر' انہیں بے اعتمادی صرف پوربی فوجوں پر تھی کیونکہ یہی لوگ بغاوت کی اصل اور بنا تھے اور انہی کے علاقوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکے تھے۔ خود مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے چند فقرے ایسے نکل گئے ہیں جن سے پنجاب اور صوبہ سرحد میں نام نہاد بغاوت کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے۔ مولانا مندرجہ ذیل عنوان قائم کر کے لکھتے ہیں۔

ہندوستانیوں پر آفت

"ہندوستانیوں پر جو مصیبت آئی وہ ناقابل فہم تھی۔ انہیں ہر جگہ شک و شبہ ہی نہیں بلکہ انتہائی بے اعتمادی کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ اس لئے پنجاب آ گئے تھے کہ انگریزوں نے پنجاب فتح کیا تو ہندوستانیوں کو ساتھ لے آئے۔ 1857ء میں سمجھا جاتا تھا کہ تمام طبقوں سے بڑھ کر ناقابل اعتماد ہندوستانی ہیں------ چنانچہ پنجاب میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ نیز ماہ جون کے اواخر تک ان تمام ہندوستانیوں سے ہتھیار لے لئے گئے جو پنجاب میں رہتے تھے۔ ڈپٹی کمشنر لاہور کی ایک رپورٹ مظہر ہے کہ ہندوستانیوں کو ہری کے پتن سے واپس بھیجنے کا انتظام کر دیا تھا اور 31 دسمبر 1857ء تک دو ہزار پانچ سو چھتیس آدمی جا چکے تھے" (22)

ہندوستانی فوج کا کردار

سوال یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر یہ آفت کیوں آئی؟ اگر یہ کوئی ملک گیر بغاوت ہوتی جس کا مقصد صرف انگریزی حکومت کا خاتمہ اور اہل وطن کی حکومت کا قیام ہوتا تو پشاور سے لے کر بنگال تک اور جنوب میں راس کماری تک ہر صوبہ کے لوگ اس میں شریک ہوتے لیکن یہ بغاوت صرف ہندوستانی فوجیوں نے کی۔ یہ ہندوستانی فوجی کون تھے؟ یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے آٹھ روپے ماہانہ کی خاطر انگریز آقاؤں کی کمان میں سارے ہندوستان کو غلام بنایا۔ ارکاٹ کے نواب چندا صاحب سے انگریزی فوج نے کلائیو کی کمان میں جنگ لڑی تو اس کے ساتھ صرف دو سو گورے تھے باقی فوج دیسی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں کسی ہندوستانی حکمران سے انگریزوں کی یہ پہلی جنگ تھی اس جنگ میں انہیں فتح ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہ کامیابی دیسی سپاہیوں کے ذریعے انگریزوں نے حاصل کی۔ جب کلائیو نے بنگال پر حملہ کیا اور سراج الدولہ کو شکست دی تو اس کی کمان میں مٹھی بھر گورے تھے باقی سپاہی دیسی تھے۔ بکسر کے مقام پر جب انگریزی فوجوں کا شجاع الدولہ، میر قاسم اور شاہ عالم سے مقابلہ ہوا تو انگریز افسروں کی کمان میں یہی دیسی سپاہی لڑے۔ سلطان حیدر علی، سلطان ٹیپو اور نواب حافظ رحمت خاں جیسے حریت پسند اور انگریز دشمن حکمرانوں کے خلاف انہی دیسی سپاہیوں نے انگریزوں کی کمان میں اپنی "بہادری" کے جوہر دکھائے۔ دلی پر حملہ کے وقت جنرل لیک کی کمان میں انہی ہندوستانی سپاہیوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور دلی فتح کر کے اس کے قدموں میں لا ڈالی۔ پنجاب، پشاور اور سندھ پر قبضہ مٹھی بھر انگریز نہیں کر سکتے تھے۔ یہی ہندوستانی سپاہی ان کی کمان میں لڑے اور ملک فتح کر کے ان کے سپرد کر دیا۔

اگر یہ ہندوستانی سپاہی ایسے ہی حریت پسند اور انگریزوں کے دشمن تھے اور یہ اہل وطن کی حکومت چاہتے تھے تو ان کی حریت پسندی اس وقت کہاں چلی گئی تھی جب وہ چند روپیوں کی خاطر اپنے اہل وطن پر گولیاں برسا رہے تھے۔ یہ سلسلہ 1856ء تک جاری رہا۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس بغاوت کی وجہ قومی یا ملی نہ تھی نہ وطن کی محبت اس میں کار فرما تھی۔ صرف خود سری، شورش اور اپنی بہادری کا گھمنڈ یا ذاتی مفادات

پیش نظر تھے۔ اگر تعصب اور صوبائی یا سیاسی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر دیکھا اور سوچا جائے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے۔

کیا باقی ہندوستان کے لوگ غدار تھے؟

سوال یہ ہے کہ صوبہ پنجاب، صوبہ سرحد، صوبہ بلوچستان، صوبہ سندھ، صوبہ بمبئی، صوبہ مدراس، صوبہ اڑیسہ، صوبہ بہار، صوبہ بنگال اور صوبہ آسام میں کروڑوں افراد آباد تھے جن میں عوام بھی تھے خواص بھی، جاگیردار، راجے اور نواب بھی تھے، علمائے دین بھی تھے اور صوفیا و خانقاہ نشین بھی۔ ان میں سے کوئی صوبہ بغاوت سے متاثر نہیں ہوا۔ کسی صوبے کے عوام غیر ملکی آقاؤں کے خلاف آستینیں چڑھا کر نہیں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان صوبوں کے علمائے دین میں سے کسی نے (ایک دو کے سوائے) اس بغاوت کے حق میں فتوے نہیں دیئے۔ کیا یہ سب انگریزوں کے ایجنٹ، غدار اور ملکی و ملی مفادات کے دشمن تھے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا، یہ سوچنا بھی ان کروڑوں افراد کی توہین ہے۔

کہا جاتا ہے کہ بغاوت یا انقلاب کی کامیابی اسی طرح ہوتی ہے کہ ابتدا میں ایک دو شہر اس سے متاثر ہوتے ہیں پھر اس کا دائرہ کار بڑھتا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ سارا ملک انقلاب کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس ہوا۔ دلی جو ہندوستان کا دارالسلطنت تھا مکمل طور پر باغیوں کے قبضے میں آ گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی بادشاہی کا اعلان ہو گیا۔ بغاوت کا دائرہ کار پھیلا اور بڑے بڑے شہر ان کے قبضے میں آ گئے۔ اگر بنگال، پنجاب، صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے عوام و خواص میں انگریزوں کے خلاف بے چینی ہوتی تو باغیوں کی بظاہر اس (عارضی) کامیابی کو دیکھ کر خصوصاً دارالسلطنت دہلی انگریزوں کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ان صوبوں کے لوگوں میں جوش پیدا ہوتا اور وہ بھی اٹھ کھڑے ہوتے مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ پنجاب اور صوبہ سرحد کے مسلمان چند سال قبل تک سکھوں کے لرزہ خیز مظالم برداشت کر چکے تھے اور انگریزوں کے زیر سایہ انہیں جو امن اور جو آسائش حاصل تھی

اس سے محروم ہونے کے لئے وہ تیار نہیں تھے۔ اسی طرح باقی صوبوں کے عوام میں اس وقت تک انگریزی حکومت کے خلاف ناراضگی نہ تھی۔ انگریزوں کے اقتدار سے قبل ہندوستان کے مختلف صوبوں میں جو بدامنی' طوائف الملوکی اور مار دھاڑ ہو چکی تھی اس کا مقابلہ جب وہ انگریزی عہد کے امن و آسائش سے کرتے ہوں گے تو انہیں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کرنا خودکشی معلوم ہوتا ہو گا۔

بہرحال وجہ کوئی بھی ہو 1857ء کی بغاوت کا دائرہ کار بہت محدود رہا اور جس طرح اچانک یہ بغاوت رونما ہوئی اس کا نتیجہ بھی یہی ہونا چاہیئے تھا۔ سرسید احمد خان اور ان کے معاصرین نے اپنی دوربینی' انگریزی حکومت کے جاہ و جلال اور ان کے تدبر و فراست سے اندازہ لگالیا تھا کہ یہ بغاوت بری طرح ناکام ہو گی اور مسلمان برباد ہو جائیں گے۔ یہ وجہ تھی کہ انہوں نے اس بغاوت کی مخالفت کی اور اسے قوم کے لئے زہر قاتل قرار دیا۔

حواشی:

1- 1857ء مولفہ غلام رسول مہر ص 96

2- داستان غدر ص 79' مولفہ راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی مطبوعہ اکادمی پنجاب ادبی دنیا منزل' لاہور

3- داستان غدر ص 136 مولفہ راقم الدولہ سید ظہیر دہلوی۔

4- بہادر شاہ ظفر کا مقدمہ ص 133 تا 139' مرتبہ خواجہ حسن نظامی۔

5- واقعات دارالحکومت دہلی۔ حصہ اول ص 691 کا حاشیہ مصنفہ بشیر الدین احمد دہلوی' مطبوعہ شمسی مشینی پریس آگرہ۔

6- داستان غدر ص 140

7- داستان غدر۔

8- "1857ء" ص 115-

9- سوانح قاسمی ص 87 مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔ شائع کردہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار' لاہور۔

10- (ملخص) سوانح قاسمی ص 93' مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی۔

11- الثورۃ الہندیہ ص 257 تا ص 261 مولفہ علامہ فضل حق خیر آبادی۔ شائع کردہ مکتبہ قادریہ لاہور۔ (یہ کتاب "الثورۃ الہندیہ" اور "باغی ہندوستان" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ فاضلانہ مقدمے اور تشریحات سے کتاب کو مفید اور ضخیم بنا دیا گیا ہے۔ اصل رسالہ بہت مختصر ہے جس کا اردو ترجمہ عبدالشاہد خان شروانی مرحوم نے کیا تھا۔ راقم الحروف نے علامہ فضل حق کے اصل رسالے کے بعض حصوں کا خلاصہ خود تحریر کیا ہے۔ یہ وضاحت اس لئے ضروری تھی تاکہ تحریف یا تصرف کا الزام غریب مولف پر عائد نہ کیا جائے۔ (پیام)

12- 1857 ص 121

13- 1857ء ص 123

14- 1857ء ص 36

15- 1857ء ص 39

16- 1857ء ص 28-

17- "1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب" ص 234 مولفہ پروفیسر مولانا علم الدین سالک مطبوعہ ماہنامہ "گل خنداں" لاہور 1857ء نمبر جولائی 1962ء مطبع پنجاب پریس' لاہور۔

18- جنرل عمر حیات خاں ٹوانہ ص 158' مولفہ مولانا غلام رسول مہر مطبوعہ پاکستان ٹائمز پریس' لاہور

19- جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات ص 586-

20- "بغاوت ہند" مولفہ سندر لال ص 123 بحوالہ جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات ص 589

21- جنگ آزادی 1857ء ص 486' ص 488-

22- "1857ء" ص 311-

✿✿✿

علمائے دیوبند کا جہاد

1857ء کی بغاوت کا سب سے اہم پہلو وہ کردار ہے جو علمائے دین نے ادا کیا۔ یہ علماء معمولی درجے کے لوگ اور دیہات کی مساجد کے نیم خواندہ ملا نہ تھے۔ ان میں سے ہر عالم اپنی جگہ ایک پہاڑ تھا اپنی استقامت وعزیمت کے لحاظ سے بھی' اپنے علم و فضل کے لحاظ سے بھی اور اپنے غیر معمولی اثر ورسوخ کے لحاظ سے بھی۔ ان کے ایک اشارے پر لاکھوں مسلمان سر کٹوانے کو تیار ہو جاتے تھے کیونکہ وہ انہیں منبر رسول" کا وارث سمجھتے تھے۔ جب اس پہلو سے 1857ء کی بغاوت کا جائزہ لیا جائے تو معاملے کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر مکتبہ فکر کے علماء نے 1857ء کی بغاوت کو فتنہ وفساد بلکہ بعض نے کھلی معصیت' ہلاکت اور گناہ قرار دیا۔ یہ علما کسی ایک فرقے سے تعلق نہ رکھتے تھے بلکہ اہل دیوبند' اہل حدیث' اہل بریلی اور اہل تشیع کے علاوہ اہل خانقاہ بھی ان میں شامل تھے۔

ہمارے وہ مورخ جنہوں نے 1857ء کی بغاوت کو "جہاد" ثابت کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں اگر وہ ان علما کے کردار اور ان کی آراء کا بھی مشاہدہ و مطالعہ کر لیتے تو شاید انہیں یہ ٹھوکر نہ لگتی۔ سب سے زیادہ افسوس تو اس کا ہے کہ 1857ء کی بغاوت کے موقع پر جو علماء موجود تھے اور جنہوں نے نہ صرف یہ کہ انگریزوں کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کی حمایت کی انہیں بھی باغیوں کی صف میں لا کھڑا کیا گیا۔ ایسے ایسے افسانے تراشے گئے کہ عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے اور حق وانصاف اپنا سر پیٹ لیتے ہیں۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی ایسی شرمناک کوشش شاید ہی کی گئی ہو۔

حاجی امداد اللہ مکی' مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی اس عہد کے

جید علما تھے اور ان میں سے بعض تو اہل اللہ میں شمار ہوتے تھے۔ جب 1857ء کی بغاوت کی آگ شعلہ زن ہوئی تو یہ علما حتی المقدور اس فتنہ وفساد سے الگ رہے مگر جب حالات خراب ہو گئے اور یہ آگ ان کے دامن تک پہنچ گئی تو انہوں نے بڑی مردانگی سے اپنا کردار ادا کیا اور باغیوں سے جان توڑ کر لڑے۔ ان کی اس جنگ کو فرنگیوں کے ساتھ جنگ بنا دیا گیا اور "تھانہ بھون" اور "شاملی" کے "جہاد" کے عنوانات جما کر نہایت مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا لیکن ایسی دستاویزات موجود ہیں جن کے مطالعے سے اس "جہاد" کی ساری حقیقت کھل جاتی ہے۔

تھانہ بھون کا "جہاد"؟

کہا جاتا ہے کہ جب دہلی پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا اور ہر طرف بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے تو "تھانہ بھون" اور اس کے نواح کے لوگ بھی انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک کی قیادت حضرت حاجی امداد اللہ مکی' مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے کی۔ انہوں نے انگریزی حکام کو نکال دیا۔ علاقے پر قبضہ کر لیا اور اسلامی حکومت قائم کر دی۔ اگر واقعی ایسا ہوا ہوتا تو ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی باک نہ ہوتی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اصل حقیقت کیا تھی؟ اور واقعات کس طرح پیش آئے؟ ان کی تفصیل مولانا رشید احمد گنگوہی کے ایک تذکرہ نگار اور اس عہد کے فاضل مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی زبانی سنیئے۔ مولانا عاشق الٰہی معمولی درجے کے عالم اور سیرت نگار نہ تھے اور نہ ان کی کتاب "تذکرۃ الرشید" کوئی غیر معروف یا دوسرے درجے کی کتاب ہے بلکہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے سوانح اور سیرت پر سب سے زیادہ مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانی اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

"حضرت گنگوہی کی سوانح عمری "تذکرۃ الرشید" جسے مولانا عاشق الٰہی نے مرتب فرما کر جماعت دیوبند کے ذمہ دار بزرگوں کی خدمت میں پیش کیا کافی تنقیح و تحقیق کے بعد یہ کتاب شائع ہوئی اس وقت تک کسی قسم کی تنقید اس کتاب کی روایتوں

پر جہاں تک میں جانتا ہوں نہیں کی گئی ہے۔" (1)

اب ملاحظہ فرمائیے اس مستند اور اکابر دیوبند کی طرف سے سند یافتہ کتاب میں تھانہ بھون کے مبینہ جہاد اور اس میں حاجی امداد اللہ مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شرکت کے بارے میں کیا لکھا گیا ہے۔

"اسی بلاخیز قصہ (یعنی 1857ء کی بغاوت) میں تھانہ بھون کا وہ فساد واقع ہوا جس میں قاضی محبوب علی خاں کی مخبری سے حضرت مولانا (رشید احمد صاحب گنگوہی) پر مقدمہ قائم ہوا جس کی ابتدا یہ تھی کہ تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خاں کا چھوٹا بھائی عبدالرحیم خاں چند ہاتھی خریدنے سہارنپور گیا۔ وہاں اس آفت رسیدہ کا کوئی بنیا قدیمی دشمن کئی دن سے ٹھہرا ہوا تھا جس کو زمیندارانہ مخمصات میں عبدالرحیم کے ساتھ خاص عداوت تھی۔ دشمن نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور فوراً حاکم ضلع سے جا رپوٹ کی کہ فلاں رئیس بھی باغی و مفسد ہے چنانچہ دہلی میں کمک بھیجنے کے لئے ہاتھی خریدنے سہارنپور آیا ہوا ہے۔ زمانہ تھا اندیشہ ناک اور احتیاط کا اسی وقت دوڑ گئی (یعنی پولیس کا دستہ) اور رئیس گرفتار ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پھانسی ہوئی اور تھانہ بھون کے نیک دل سرکاری خیر خواہ زمیندار کو مظلوم بھائی سے دنیا میں ہمیشہ کے لئے جدا ہو جانے کی خبر ملی۔" (2)

بعض دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بھائی کے پھانسی پانے کی خبر سن کر تھانہ بھون کے رئیس قاضی عنایت علی خاں مشتعل ہو گئے اور انہوں نے انگریزی حکام پر یورش کر کے انہیں نکال دیا اور ایک مجمع کثیر کے ساتھ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ تذکرۃ الرشید کے مولف لکھتے ہیں کہ:۔

"اس بدامنی کی حالت میں ---- عام باشندگان قصبہ کی یہ حالت ہو گئی گویا ان کا مربی و منتظم بادشاہ سر سے اٹھ گیا ---- پس یہ لوگ اعلیٰ حضرت حاجی صاحب (حاجی امداد اللہ مکی) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ بلا کسی حاکم کی سرپرستی کے گزران دشوار ہے۔ گورنمنٹ نے باغیوں کی بغاوت کے باعث اپنا امن اٹھا لیا اور بذریعہ اشتہار عام اطلاع دے دی ہے کہ اپنی اپنی حفاظت ہر شخص کو خود کرنی چاہیے اس

لئے آپ چونکہ ہمارے دینی سردار ہیں اس لئے دنیاوی نظم حکومت کا بار بھی اپنے سر رکھیں اور امیرالمومنین بن کر ہمارے باہمی قضیئے چکا دیا کریں۔ اس میں شک نہیں کہ اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب مکی) کو ان کی درخواست کے موافق ان کے سر پر ہاتھ رکھنا پڑا اور آپ نے دیوانی و فوجداری کے جملہ مقدمات شرعی فیصلہ کے موافق چند روز تک قاضی شرع بن کر فیصلہ بھی فرمائے ---- مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی مع دیگر خدام یہیں رہ پڑے۔" (3)

مولانا عاشق الٰہی لکھتے ہیں کہ "اسی قصہ نے (ان بزرگوں یعنی مولانا امداد اللہ، مولانا رشید احمد اور مولانا محمد قاسم کے بارے میں۔ ناقل) مفسدوں میں شریک ہونے کی راہ چلائی اور مخبروں کو جھوٹی سچی مخبری کا موقع دیا۔" (4)

آپ یہ ساری عبارت پڑھ جائیے کہیں ادنیٰ سا شائبہ بھی گزرتا ہے اس امر کا کہ تھانہ بھون کے ان بزرگوں نے انگریزوں کے خلاف کسی بغاوت کی قیادت کی یا انگریزوں سے جنگ کی؟ اگر ثابت ہوتا ہے تو اتنا کہ علاقے کے رئیس قاضی عنایت علی خاں نے اپنے بھائی کی پھانسی کی خبر سن کر لوگوں کو جمع کیا اور انگریزی نظام درہم برہم کر ڈالا۔ اس کارروائی کی بھی تھانہ بھون کے علماء نے مخالفت کی اور اس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ چنانچہ مولانا رشید احمد گنگوہی کے سیرت نگار کا بیان ہے کہ "سنا گیا ہے کہ ہمارے اکثر دینی حضرات نے اس کارروائی سے منع کیا" (5) لیکن چونکہ انگریزی حکومت نے اعلان کر دیا تھا کہ جن علاقوں سے سرکار نے امن اٹھا لیا ہے وہاں کے لوگ خود اپنی جان و مال کی حفاظت کا انتظام کریں اس لئے جب قصبہ کے لوگوں نے حضرت حاجی امداد اللہ مکیؒ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے مقدمات فیصل فرما دیا کریں تو انہوں نے یہ درخواست قبول کر لی اور مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ ان حضرات کے اس اقدام کو بغاوت کی قیادت قرار دینا سراسر خلاف واقعہ اور تاریخ کو مسخ کرنے کی مکروہ کوشش ہے۔

بزرگان دیوبند کی باغیوں سے جنگ

مولانا رشید احمد گنگوہی کے فاضل تذکرہ نگار نے ایک عجیب انکشاف کر کے

اس عمارت ہی کو منہدم کر دیا جو 1857ء کی شورش کو جہاد کی صورت دینے اور اس میں علمائے دین کی شرکت ثابت کرنے کی غرض سے تعمیر کی گئی تھی۔ چنانچہ مصنف مذکور لکھتے ہیں کہ "ان ایام میں آپ (مولانا رشید احمد گنگوہی) کو ان مفسدوں سے مقابلہ بھی کرنا پڑا جو غول کے غول پھرتے تھے۔ حفاظت جان کی غرض سے تلوار اپنے پاس رکھتے تھے اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بہادر شیر کی طرح نکلے چلے آتے تھے۔ ایک مرتبہ ایسا ہی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا قاسم العلوم (مولانا محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی صاحب (حاجی امداد اللہ مکی) و نیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں سے مقابلہ ہو گیا۔ یہ نبرد آزما اور دلیر جتھا (یعنی متذکرہ علمائے دیوبند اور ان کے ہمراہی) اپنی سرکار کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا اس لئے اٹل پہاڑ کی طرح پر اجما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جاں نثاری کے لئے تیار ہو گیا۔

اللہ رے شجاعت و جواں مردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہو جائے وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لئے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے ایسے جمے رہے گویا زمین نے پاؤں پکڑ لئے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ صاحب رحمتہ اللہ علیہ زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے" (6)

مولانا عاشق الٰہی صاحب کی اس عبارت نے فیصلہ کر دیا کہ حضرت حاجی امداد اللہ مکی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جہاد انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ سرکار انگریزی کے باغیوں اور دشمنوں سے کیا حتیٰ کہ ایک بزرگ اور حافظ قرآن نے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کر دیا۔ جنہیں مولانا رشید احمد گنگوہی کے تذکرہ نگار نے شہید کا خطاب دیا۔ بقول مولانا عاشق الٰہی یہ بزرگ سرکار برطانیہ کے باغیوں پر جاں نثاری کے لئے میدان میں ڈٹ گئے۔ مگر برا ہو ان سیاسی مصلحتوں کا جنہوں نے تاریخ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا اور دن کو رات اور رات کو دن بنا دیا۔ بہر حال اس واقعے کے بعد جب بغاوت کا ہنگامہ فرو ہو گیا اور دوبارہ انگریزوں کا غلبہ ہو گیا تو بعض لوگوں نے

مخبری کی۔ انگریز حکام کو غلط خبریں پہنچائیں اور دیوبند کے ان امن پسند علماء اور سرکار برطانیہ کے جاں نثاروں کو بغاوت کے جرم میں ماخوذ کروا دیا۔ ان پر مقدمہ چلا۔ اس واقعے کی تفصیلات "تذکرۃ الرشید" کے مولف نے اس طرح بیان کی ہیں۔

"جب بغاوت و فساد کا قصہ فرو ہوا اور رحمدل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پا کر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیر خواہ اپنے کو ظاہر کریں انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات پر بھی بغاوت کا الزام لگایا اور یہ مخبری کی کہ تھانہ بھون کے فساد میں اصل الاصول یہی لوگ تھے اور شاملی کی تحصیل پر حملہ کرنے والا یہی گروہ تھا۔ بستی کی دو کانوں کے چھپر انہوں نے تحصیل کے دروازے پر جمع کئے اور اس میں آگ لگا دی یہاں تک کہ جس وقت آدھے کواڑ جل گئے ابھی آگ بجھنے نہ پائی تھی کہ ان نڈر ملاؤں نے جلتی آگ میں قدم بڑھائے اور بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھس کر خزانہ سرکار کو لوٹا تھا۔" (7)

آگے چل کر مولانا رشید احمد گنگوہی کے تذکرہ نگار لکھتے ہیں کہ:۔

"حالانکہ یہ کمبل پوش، فاقہ کش، نفس کش حضرات ان فسادوں سے کوسوں دور تھے۔" (8)

آخر ان حضرات پر مقدمہ چلا "حق تعالیٰ کا شکر ہے کہ سچ سچ ہو کر رہا اور جھوٹ جھوٹ، ان حضرات پر اتہام کا بحمد للہ کوئی ثمرہ مرتب نہ ہوا اگرچہ خدائی آزمائش میں جھڑ جھڑائے گئے، پریشانیاں اٹھائیں، کوفت سہی، روپوش رہے مگر انجام کار حق کو غلبہ ہوا اور "دودھ کا دودھ پانی کا پانی"۔ ان پاک نفوس اور ملکوتی صفات بدنوں پر آنچ نہ آئی۔" (9)

اس ساری روداد میں ان اکابر دیوبند پر بغاوت کے الزام کو تہمت قرار دیا گیا ہے۔ افترا کہا گیا ہے انہیں سرکار کا خیر خواہ اور فتنہ و فساد سے کوسوں دور ثابت کیا گیا ہے۔ شاملی کی تحصیل کو آگ لگانے اور سرکاری خزانہ پر قبضہ کرنے کی جو داستان بعض تذکرہ نگاروں نے علمائے دیوبند سے منسوب کی ہے "تذکرۃ الرشید" میں اس کی سختی

سے تردید کی گئی ہے' بغاوت کے مقدمے سے ان کی برات دکھائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ
اگر ان حضرات نے بغاوت کی قیادت کی ہوتی' انگریزی انتظام حکومت کو درہم برہم کیا
ہوتا اور بہ زور طاقت قصبے پر قبضہ کر لیا ہوتا' انگریزی فوجوں سے جنگ کی ہوتی تو اس
صورت میں انگریزی عدالت انہیں کبھی معاف نہ کرتی بلکہ سرعام پھانسی دے دی جاتی
مگر ایسا ممکن ہی نہ تھا کیونکہ ان حضرات نے تو سرکار برطانیہ کے باغیوں سے جنگ کی
تھی اور مفسدوں کے تسلط سے قصبہ کو محفوظ رکھنے میں اپنے ایک عزیز (حافظ ضامن علی
صاحب) کی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کو باعزت بری کر
دیا گیا اور مولانا عاشق الٰہی صاحب کے بقول دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو گیا "ان
حضرات پر کوئی آنچ نہ آئی"۔ اس کے بعد اگر کسی مصنف یا مورخ نے ان حضرات کو
1857ء کی بغاوت میں شریک ثابت کرنے کے لئے واقعات کو کھینچ تان کر اپنی حسب
خواہش نتائج نکالے ہیں تو یہ اس کا اپنا فعل ہے اس سے ان حضرات کا دامن داغدار
نہیں ہوتا۔

انگریزی حکومت اور علمائے دیوبند

1857ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد دارالعلوم دیوبند معرض وجود میں آیا جس
نے اکناف عالم میں شہرت پائی اور بڑے بڑے جید علماء اس درس گاہ سے فارغ التحصیل
ہو کر نکلے۔ ان علما نے ملک کے قریہ قریہ میں علوم دینیہ کے چراغ روشن کئے۔ اس کے
بانیوں میں مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے عالم بے ریا شامل تھے۔ رفتہ رفتہ دیوبند ایک
مکتبہ فکر اور ایک تحریک بن گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ علمائے دیوبند کی بہت بڑی
اکثریت نے انگریزی حکومت کے بارے میں وہی روش قائم رکھی جو اس دارالعلوم کے
بانیوں نے قائم کی تھی۔ چنانچہ بمبئی کے ایک صاحب نے کہ نام نامی جن کا علی محمد تھا
دیوبند کے ایک فاضل مفتی مولانا عبدالعزیز کی خدمت میں چار سوال اس غرض سے بھیجے
کہ مولانا موصوف ان کے بارے میں فتویٰ دیں۔ ان میں ایک سوال یہ تھا۔

سوال= سلطنت انگلشیہ جس میں ہم کو اپنے امور دینیہ پر عمل کرنے سے روک

نہیں بہتر ہے یا حکومت روس جو سخت متعصب اور دشمن قدیمی سلطان روم کی ہے۔

مولانا مفتی عبدالعزیز نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"سلطنت انگلشیہ بہتر ہے کیونکہ سرکار دولت مدار مثل روس متعصب نہیں
اور سلطان (روم جو ایک بڑا بادشاہ ذی اقتدار اہل اسلام خادم حرمین شریفین اور حافظ
بیت المقدس و کربلائے معلیٰ کے ہے) اور سرکار دولت مدار میں برخلاف روس کے اتحاد
قائم چلا آتا ہے۔ اگر بالفرض والتقدیر سرکاری عملداری مملکت روس وغیرہ سے بہتر نہ
سمجھی جاوے تب بھی رعایا اہل اسلام کو شرعاً" حرام ہے کہ سرکار کے خلاف روس یا
سلطان روم وغیرہ سے درپردہ رابطہ و اتحاد پیدا کرے بلکہ جو مسلمان سرکاری عملداری
میں چند روز کے واسطے وارد ہو اس کو بھی مخالفت سرکار کی شرعاً" حرام ہے (اس کے بعد
شرع کا مسئلہ بیان کیا گیا پھر اس کا ترجمہ کر کے لکھا گیا ہے۔ ناقل) یعنی جو سوداگری کے
طور پر مسلمان حکومت کفار میں داخل ہو اس کی مخالفت کرنی شرعاً" حرام ہے۔ پس جب
تاجر کو جو عارضی طور پر واسطے چند روز کے رعایا میں داخل ہوا ہے مخالفت درست نہیں
تو رعایا اصلی کو علم مخالفت کا بلند کرنا شرعاً" کب درست ہو سکتا ہے"۔ (10)

یہاں چند امور کی وضاحت ضروری ہے۔ لدھیانہ کے ایک بہت بڑے عالم
گزرے ہیں مولانا عبدالقادر لدھیانوی امیر کابل دوست محمد خاں مولانا کا بڑا معتقد تھا اور
معزول امیر کابل شاہ زمان لدھیانہ کے دوران قیام میں مولانا کے ہاتھ پر بیعت کر کے ان
کے حلقہ مریداں میں شامل ہو گیا تھا۔ مولانا عبدالقادر پنجاب کے واحد عالم تھے جنہوں
نے 1857ء میں انگریزوں کی مخالفت کی تھی بلکہ باغیوں کی قیادت کی تھی اور ان کے لشکر
لے کر دہلی چلے گئے تھے (مگر لدھیانہ کو انگریزوں کے لئے چھوڑ گئے تھے) مولوی
عبدالعزیز لدھیانوی' مولوی محمد لدھیانوی اور مولوی عبداللہ لدھیانوی انہی مولانا
عبدالقادر کے فرزند تھے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بھی اپنے والد گرامی کے ساتھ دہلی گئے تھے
مگر 1857ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد لدھیانہ واپس آ گئے تھے۔

انگریزوں کے بارے میں مولوی عبدالعزیز لدھیانوی نے جو فتویٰ دیا اس پر
مولانا' مفتی محمد اور مولانا عبداللہ تینوں کے دستخط ہیں۔ ان علماء کے بارے میں مولانا محمد

فضل عظیم خطیب دیوبند نے اسی فتوے میں یہ رائے تحریر فرمائی ہے۔

"میں مولوی عبدالعزیز صاحب و مولوی محمد صاحب و مولوی عبداللہ صاحبان کو بخوبی جانتا ہوں نہایت متقی اور ذی علم ہیں ان سے بہتر عالم ملک پنجاب میں نہیں ہیں۔ حررہ الراجی عفور بہ الکریم محمد فضل عظیم خطیب دیوبند عفی عنہ"_(11)

دارالعلوم دیوبند کے خطیب کے بقول ملک پنجاب کے ان سب سے بڑے علماء نے انگریزوں کے بارے میں جو فتویٰ دیا اس کی رو سے:۔

(1) سلطنت انگلشیہ روس سے بہتر ہے کیونکہ سرکار دولت مدار روس کی طرح متعصب نہیں۔

(2) سلطان روم اور سلطنت برطانیہ میں قدیم سے اتحاد چلا آتا ہے۔

(3) اگر مان بھی لیا جائے کہ سرکار برطانیہ روس سے بہتر نہیں ہے تب بھی اہل اسلام کو جو سرکار برطانیہ کی رعایا ہیں روس یا سلطان روم سے درپردہ اتحاد کرنا یا رابطہ قائم کرنا شرعاً" حرام ہے۔

(4) جو مسلمان کسی غیر ملک سے سرکاری عملداری میں داخل ہو اس پر بھی مخالفت سرکار شرعاً" حرام ہے۔

(5) اس صورت میں اصلی رعایا کو مخالفت کا علم بلند کرنا شرعاً" کب درست ہو سکتا ہے۔(12)

اس سے زیادہ واضح رائے انگریزوں کی اطاعت کرنے کے بارے میں اور کیا ہو سکتی ہے۔ جو دیوبندی مکتبہ فکر کے ان جید علماء نے ظاہر کی جن کا ہم پایہ کوئی عالم اس وقت ملک پنجاب میں نہ تھا۔ اس فتوے پر 53 علماء کے دستخط ہیں۔ ان میں لدھیانہ کے علاوہ جالندھر، ہوشیارپور، کپور تھلہ، امرتسر، گجرات، جموں، فیروزپور، قصور، ملتان، پاک پٹن، انبالہ، سہارنپور، دیوبند، گنگوہ، مظفرنگر، دہلی، رامپور، بریلی، مراد آباد تک کے علماء شامل ہیں جن میں دیوبندی بھی ہیں اور غیر دیوبندی بھی۔ ان میں ایک بزرگ توکل شاہ بھی ہیں جن کے بارے میں کتاب کے حاشیے پر یہ عبارت درج ہے "یہ حضرت علم باطنی میں کمال درجے کے مشہور ہیں۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں مسلمان ان کے معتقد ہیں"_(13)

گویا یہ فتویٰ صرف مولانا مفتی عبدالعزیز، مولانا مفتی محمد لدھیانوی، مولانا مفتی عبداللہ لدھیانوی اور مولانا محمد فضل عظیم خطیب دیوبند یا صرف 53 علماء کا نہیں بلکہ ان لاکھوں مسلمانوں کی رائے ہے جن کی یہ بزرگ روحانی قیادت کر رہے تھے۔ سرسید احمد خان نے بھی یہی کہا تھا اور ان کے بعض معاصرین نے بھی یہی رائے ظاہر کی تھی کہ مسلمان جس ملک میں رہیں اس کی حکومت کے وفادار رہیں خواہ وہ حکومت مسلمانوں کی ہو خواہ کافروں کی۔ اسی لئے انہوں نے مسلمانوں کو 1857ء کی بغاوت میں شرکت سے روکا تھا۔ دیوبندی مکتبہ فکر کے جید علماء تو اپنے اس فتوے میں انگریزوں کے خلاف ساز باز کو شرعاً" حرام قرار دے رہے ہیں۔ سرسید احمد خاں اس حد تک آگے جانے کی جرات نہ کر سکے۔

علمائے دین کا انگریزوں سے تعاون

اگر حالات و واقعات کا غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت کسی ثبوت کی محتاج نہیں رہتی کہ شاہ عالم ثانی کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب انگریزوں نے ہندوستان کی عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو عوام نے اطمینان کا سانس لیا اور انگریزوں کے اس اقدام پر کسی برہمی کا اظہار نہیں کیا نہ فوج نے نہ جاگیرداروں نے نہ علمائے دین نے بلکہ اس دور کے چوٹی کے علماء نے انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا۔ ان سے عہدے قبول کئے ان کی ملازمتیں اختیار کیں۔ اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ قوم اور ملک سے غداری کر رہے تھے۔ ان اکابر کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ ہے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ دین اور ضروریات دین سے پوری طرح باخبر ان علماء پر یہ حقیقت واضح ہو گئی تھی کہ انگریزوں کی حکومت کو استحکام نصیب ہو گیا ہے۔ شاہ عالم نے مرہٹوں کے مظالم اور افراتفری سے تنگ آ کر خود انگریزوں کو بلایا اور حکومت ان کے سپرد کر دی (14)_ ملک سے بدنظمی اور لوٹ مار کا خاتمہ ہو گیا ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ انگریزوں کے عمال ملک کا نظم و نسق چلا رہے ہیں اگر ان کے ساتھ تعاون نہ کیا گیا تو انتظام ملک کو نقصان پہنچے گا چنانچہ انہوں نے برطانوی حکومت سے تعاون کرنے کو

ضرورت دین میں سے ایک اہم ضرورت سمجھا۔ اگر ان کے تعاون کو اس نقطہ نظر سے نہ دیکھا جائے تو یہ اکابر علماء خود غرض' جاہ پسند اور زر طلب، ثابت ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ علمائے دین کی اتنی بڑی تعداد کے بارے میں ایسا سوچنا ان اکابر کو رسوا کرنا ہے۔ چنانچہ ہمارے عہد کے ایک فاضل مولف نے اپنی کتاب میں ان جید علمائے دین کے اسمائے گرامی درج کئے ہیں جنہوں نے بقول مولف سرکار کمپنی کا اقتدار مستحکم کیا۔ فہرست ملاحظہ ہو۔

"دہلی میں دبیرالدولہ فرید الدین' منشی زین العابدین' مفتی صدرالدین آزردہ' (مولانا فضل حق خیر آبادی کے والد بزرگوار) مولوی فضل امام خیر آبادی' (مولانا فضل حق خیر آبادی کے عم محترم) مولوی محمد صالح خیر آبادی' (مولانا فضل حق خیر آبادی کے برادر مکرم) منشی فضل عظیم خیر آبادی' خود مولانا فضل حق خیر آبادی۔ بدایوں میں مولوی فضل رسول' مولوی علی بخش صدر الصدور۔ مراد آباد میں مولوی عبدالقادر چیف رامپوری۔ الہ آباد میں مفتی اسد اللہ اور قاضی عطا رسول چریا کوٹی۔ کلکتہ میں قاضی نجم الدین خاں کاکوروی اور ان کے صاجزادگان قاضی سعید الدین' مولوی حکیم الدین اور علیم الدین وغیرہ۔ مدراس میں قاضی ارتضا علی گوپاموی اور ناسک میں خان بہادر مولوی عبدالفتاح مفتی وغیرہ برصغیر پاک و ہند کے وہ اعاظم اور افاضل ہیں جنہوں نے منصب افتا اور صدر الصدور کے ذریعے سرکار کمپنی کے انتظام و اقتدار کو بحال اور مضبوط کیا"_ (15)

فتویٰ جہاد اور علمائے دین

یہ تو وہ علمائے دین تھے جنہوں نے 1857ء سے قبل حکومت برطانیہ کے ساتھ تعاون کیا اور سرکار کا انتظام و اقتدار بحال کرنے میں اس کے ساتھ تعاون کیا۔ آیئے دیکھیں کہ 1857ء کا ہنگامہ شروع ہونے پر علمائے دین نے کیا کردار ادا کیا۔

اس سلسلے میں اس فتوے کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے جو 1857ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے بعد علمائے دہلی کے دستخط اور مہروں سے جاری کیا گیا تھا۔ یہ فتویٰ کیسے حاصل

کیا گیا؟ اب اس حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھ چکا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

جنرل بخت خاں جب بریلی سے باغی فوج اور خزانہ لے کر دہلی آیا تو اس نے علماء کو جامع مسجد میں جمع کیا ایک فتویٰ تیار کیا گیا اور علماء کو سنا کر ان سے کہا گیا کہ اس پر اپنی مہر ثبت کریں۔ ایک مصنف لکھتے ہیں کہ اس فتوے پر 34 علماء کے دستخط ہیں۔ مصنف' موصوف نے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک وہ جو فتوے کے بانی اور محرک تھے۔ دوسرے وہ جن کے دستخط اس فتوے پر ہیں مگر وہ دل سے اس تحریک میں شامل نہیں تھے بلکہ انہوں نے انگریزوں کو چھپایا' جاسوسی کے فرائض سرانجام دیئے اور تحریک آزادی کی مخالفت کی۔ ان میں یہ حضرات ہیں۔ (1) شیخ الکل میاں سید محمد نذیر حسین (2) شمس العلماء مولوی ضیاء الدین (3) مولوی سید محبوب علی جعفری (4) مفتی صدرالدین آزردہ (5) مولوی حفیظ اللہ خاں۔ (16)

ان میں سے مولوی سید نذیر حسین صاحب نے ڈر کر دستخط کئے تھے۔ مولوی صاحب مرحوم کا ایک سوانح نگار لکھتا ہے "آفت یہ ٹوٹ پڑی کہ دوران بغاوت جنرل بخت خاں نے ان مولویوں سے زبردستی جہاد کے فتوے پر مہریں کرا لیں۔ گورنمنٹ برطانیہ کو ان مہروں کی خبر ہوئی تو بجائے انعام و اکرام اور خلعت خیر خواہی کے جاں بخشی پر اکتفا کیا"_ (17)

یہاں مولف کتاب سے سہو ہو گیا ان کی نظر سے یہ واقعہ نہ گزر سکا کہ مولوی سید نذیر حسین صاحب کو ایک ہزار تین سو روپے انعام بھی ملا تھا اور یہ صلہ تھا ایک میم کی جان بچانے کا۔

اسی عہد کے ایک ممتاز عالم ابو سعید مولانا محمد حسین بٹالوی نے بھی اس فتوے پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ فتویٰ علمائے دہلی سے کیسے حاصل کیا گیا۔ یہ ممتاز عالم' شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کے بیان پر کسی قسم کے شک و شبہ کا اظہار کیا جا سکے۔ مولانا بٹالوی لکھتے ہیں۔ "مولوی سرفراز علی نے بحکم بخت خاں وہ فتویٰ پڑھ کر سنایا۔ جب وہ فتویٰ تمام ہوا تو بخت خاں وغیرہ باغی افسروں نے علماء کو حکم دیا کہ اس فتوے پر دستخط کرو۔ پس سب نے بخوف جاں

دستخط کردیئے اور اگر وہ دستخط نہ کرتے تو اسی وقت سب تلوار سے قتل کردیئے جاتے یا توپ سے اڑادیئے جاتے"_

مولانا محمد حسین بٹالوی اپنے اس دعوے کی دلیل پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ (اگر انہوں نے اپنی خوشی سے اور اسے ایک مذہبی فریضہ سمجھ کر دستخط کئے ہوتے تو وہ اس جہاد میں شریک ہوتے۔ ناقل) مگر وہ لوگ دستخط کرکے پھر گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ جہاد میں شریک ہوئے یہی وجہ ہے کہ جب گورنمنٹ انگلشیہ کا دہلی پر دوبارہ تسلط ہوا تو گورنمنٹ نے ان دستخط کرنے والے مولویوں کو بری الذمہ قرار دیا۔ نہ کسی کو پھانسی دی نہ کسی کا گھر لوٹا-------دوسری دلیل یہ ہے کہ ان دستخط کرنے والے مولویوں میں سے مولوی حفیظ اللہ خاں اور مولوی نذیر حسین محدث اور ان کے بیٹے مولوی شریف حسین اور ان کے شاگرد مولوی محمد صدیق پشاوری اور مولوی عبداللہ غزنوی نے ایک میم کو زخمی پاکر امن دیا اور اپنے گھر میں لے جاکر اس کے زخموں کا علاج کرکے جب موقع پایا سرکاری کیمپ میں پہنچا دیا جس پر انکو سرکار کی طرف سے انعام واکرام بھی ہوا۔ اگر ان کا اس فتوے پر مہر کرنا دلی ارادے سے ہوتا تو یہ خیر خواہانہ کام ان سے کیوں ہوتا"_ (18)

اب اس فتوے پر دستخط کرنے والے ایک اور ممتاز عالم مفتی صدر الدین خاں آزردہ کی قلبی کیفیت کا اندازہ لگائیے اور دیکھئے کہ انہوں نے اس فتوے پر کس دل سے دستخط کئے تھے۔ مفتی صاحب کا ایک تذکرہ نگار لکھتا ہے کہ:۔

"غدر 1857ء کے بعد آپ (مفتی صدر الدین خاں آزردہ) بھی مختلف مصائب اور دقتوں میں پھنس گئے تھے۔ مفسدوں نے آپ سے جواز جہاد پر زبردستی مہر کرانی چاہی تو آپ نے مہر کے ساتھ یہ الفاظ بھی لکھ دیئے "فتویٰ بالجبر"_ مفسدوں نے اس لفظ کو "بالخیر" سمجھ کر پیچھا چھوڑ دیا مگر جب بعد از فتح دہلی دفتر سے وہ کاغذ برآمد ہوا تو سرکار نے (مفتی صاحب کو) پکڑا اور جواب طلب کیا۔ آپ نے "فتویٰ بالجبر" ثابت کرکے رہائی پائی۔ اس رستخیز بے جا کے زمانے میں تمام جائداد بھی ضبط ہوگئی تھی۔ جب کوئی جرم ثابت نہ ہوا تو لاٹ صاحب کے رحم نے نصف جائداد واگزاشت کردی۔ (19)

حواشی:

1_ سوانح قاسمی صفحہ 99 مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی مطبوعہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور نمبر2

-2 تذکرۃ الرشید صفحہ 73 مولفہ مولانا عاشق الٰہی مطبوعہ بلالی اسٹیم پریس

4-3 تذکرۃ الرشید صفحہ 74

-5 تذکرۃ الرشید صفحہ 74 کا حاشیہ

-6 تذکرۃ الرشید صفحہ 74 و صفحہ 75

-7 تذکرۃ الرشید صفحہ 76

-8 تذکرۃ الرشید صفحہ 76

-9 تذکرۃ الرشید صفحہ 76

-10 نصرت الابرار صفحہ 9 مولفہ مولانا مولوی محمد صاحب مفتی لدھیانوی- مطبع صحافی لاہور- ایچسن گنج _ اس کتاب کا ایک ایڈیشن اصل کا فوٹو لے کر انجمن ارشاد المسلمین 6_ بی شاداب کالونی حمید نظامی روڈ لاہور نے بھی شائع کیا ہے (مولف)

-11 نصرۃ الابرار صفحہ 6 مولفہ مولانا مولوی محمد مفتی لدھیانوی

-12 نصرۃ الابرار (ملخص) صفحہ 9

-13 نصرت الابرار صفحہ 20

-14 داستان غدر صفحہ 80 بہادر شاہ ظفر کی تقریر مولفہ راقم الدولہ ظہیر دہلوی

-15 "جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات" صفحہ 55 کا فٹ نوٹ مولفہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

-16 جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات صفحہ 409 مولفہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

-17 حیاۃ النذیر حصہ دوم صفحہ 47 مولفہ سید افتخار عالم بلگرامی ثم الماردہری مطبوعہ شمسی پریس دہلی 1912ء کتاب کا فٹ نوٹ

-18 اشاعۃ السنۃ جلد نمبر5 نمبر1 بحوالہ جنگ آزادی واقعات و شخصیات صفحہ 414 وصفحہ 415

-19 خم خانہ جاوید حصہ اول صفحہ 54 مولفہ لالہ سری رام
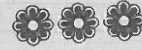
شیعہ علما کا جہاد

مسلمانوں کا دوسرا بڑا فرقہ شیعہ حضرات کا ہے اور بلاشبہ ان میں بڑے پائے کے عالم گزرے ہیں۔ اس مرتبے کے علماء 1857ء میں بھی موجود تھے ان میں سلطان العلما سید محمد صاحب مجتہد العصر کا نام سرفہرست ہے۔ جب لکھنؤ میں انگریزوں کے خلاف ہنگامہ ہوا تو موصوف نے نہ صرف اس بغاوت میں حصہ نہیں لیا بلکہ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد اپنے راسخ الاعتقاد مقلدین سے شہادت حاصل کی کہ وہ "بدمعاشوں" کے اس ہنگامے میں شریک نہیں تھے۔ (1) "چند فقرائے مومنین نے حسبتہ اللہ اس مہر پر گواہی کی---- بلکہ بعض امراء جو خیر خواہ سرکار تھے اور کیفیت واقعی بیان کر سکتے تھے' سمجھا سکتے تھے لب بھر رہے' واہ"۔ (2)

یہی مصنف لکھتے ہیں کہ بغاوت فرو ہونے کے بعد جن لوگوں کو صلہ و انعام سے نوازا گیا ان میں لکھنؤ کے ممتاز عالم و مجتہد سلطان العلماء سید محمد صاحب بھی تھے جنہیں سرکار انگریزی سے آٹھ سو روپے ماہوار کی پنشن دائمی نسلاً" بعد نسل مقرر ہوئی"۔ (3)

مولانا سید کمال الدین حیدر حسینی المشہدی نے اپنی اس کتاب میں ایک اور انکشاف کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ "رات کو کسی نے ایک اشتہار جامع مسجد پر لگا دیا جس نے لوگوں کو بہت جوش دلایا۔ اس اشتہار سے پہلے اہل اسلام کا ایسا ارادہ نہ تھا-----
خصوصاً" جہال اور عوام زیادہ تر مستعد لڑائی ہوئے اور مولوی احمد سعید' شاہ غلام علی کے نواسے مجتہد اہل سنت وہ جامع مسجد میں علم جہاد کے اٹھانے کے باعث ہوئے اور اہل اثناء عشری شریک اس جہاد کے نہ ہوئے کس واسطے کہ ان کے مذہب میں غیبت امام

میں جہاد حرام ہے"۔ (4)

اس فتوے نے ثابت کر دیا کہ شیعہ فرقہ ازروئے شرع اس جنگ کو جہاد قرار نہیں دیتا تھا کیونکہ اہل تشیع کے مذہب میں جہاد اس وقت تک حرام ہے جب تک امام زمانہ موجود نہ ہو۔ 1857ء میں کسی امام کا وجود نہ تھا اس لئے شیعہ حضرات کے علماء نے اس بغاوت کو نہ جہاد قرار دیا اور نہ اس میں حصہ لیا بلکہ اپنے زیر اثر افراد کو اس بغاوت میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ چنانچہ اسی عہد کا ایک مورخ لکھتا ہے کہ "سلطان العلماء مجتہد عصر مولوی سید محمد صاحب ان کی عالی قدر اولاد ممتاز العلماء مجتہد ثانی سید محمد نقی صاحب، فخر العلماء مجتہد ثالث سید محمد صاحب، مرزا محمد صاحب فاضل اخباری، مولوی سید احمد علی صاحب، مفتی میر محمد عباس صاحب وغیرہ جو علمائے اثنا عشری میں سے تھے ہرچند کہ ان بزرگوں سے مفسد باغیوں نے بہت کچھ کہا اور انگریزوں سے جنگ پر آمادہ کرنا چاہا بلکہ عہدوں کا لالچ بھی دیا مگر ان حضرات نے بہت خوبصورتی سے ٹال دیا بلکہ درپردہ وعظ و نصیحت کے ذریعے ایسے لوگوں کو اس بلوہ میں حصہ لینے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے اور ان میں سے ایک عالم بھی مرزا برجیس قدر بہادر کے دربار میں حاضر نہ ہوا۔ (5) (جنہیں باغیوں نے حضرت محل کی سرپرستی میں لکھنؤ پر عارضی قبضے کے دوران تخت نشین کر دیا تھا۔ پیام)

شیعہ علما کی بصیرت

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ جہاد یا مقدس جنگ نہ تھی تو غیر ملکی حکومت کے خلاف آزادی کی جدوجہد تو تھی (جیسا کہ کہا جاتا ہے) اگر یہ مقتدر شیعہ علماء اسے مقدس جہاد نہیں سمجھتے تھے تو اس میں قومی جنگ کی حیثیت سے شریک ہو جاتے۔ مگر واقعات ثابت کرتے ہیں کہ یہ اکابر اس بغاوت کو آزادی کی جنگ بھی قرار نہیں دیتے تھے بلکہ باغیوں کو فتنہ پرداز اور مفسد اور بغاوت کو فساد اور بلوہ سمجھتے تھے، بالکل اسی طرح جس طرح اکابر دیوبند نے اسے فتنہ و فساد قرار دیا تھا۔ (6) یہی نہیں کہ یہ مقتدر شیعہ علماء اور مجتہد خود اس میں شریک نہ ہوئے بلکہ "ظفر نامہ وقائع غدر" کے بیان

کے مطابق لوگوں کو بھی اس فتنہ و فساد اور بلوے میں شریک ہونے سے روکتے رہے۔

ظاہر ہے کہ اتنے بلند پایہ علماء کو نہ تو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ حرص و ہوا کا اسیر۔ ان کے اس اقدام کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں کہ یا تو اپنی خداداد بصیرت سے انہوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ بغاوت بری طرح ناکام ہو گی اور انگریزوں کا دوبارہ تسلط قائم ہونے کے بعد اہل شہر کو بری طرح انتقام کا نشانہ بنایا جائے گا۔ لوگ ذلیل و خوار کئے جائیں گے اور مسلمان برباد ہو کر رہ جائیں گے یا مذہبی اور اصولی لحاظ سے وہ باغیوں کے اس اقدام کو درست نہ سمجھتے تھے۔ وجہ اور سبب خواہ کوئی ہو شیعہ علمائے کرام اور مجتہدین نے 1857ء کی بغاوت میں شرکت سے انکار کر دیا اور اپنے زیر اثر افراد کو بھی اس میں شرکت سے باز رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔

علامہ علی الحائری کا فتویٰ

1857ء کی بغاوت ختم ہو گئی، انگریزوں کا اقتدار بحال ہو گیا، ہر طرف امن و امان قائم ہو گیا۔ ہمارے بہت سے علماء جنہوں نے 1857ء اور اس سے پہلے کی بدامنی کے لرزہ خیز واقعات کا تاریخ میں مطالعہ کیا تھا اس امن و آشتی کو نعمت خداوندی سمجھتے تھے۔ جب بھی کوئی موقعہ آتا وہ اپنے اہل فرقہ کو ہدایت کرتے کہ اس امن و آشتی کی قدر کرو اور سرکار برطانیہ کے خیر خواہ رہو۔ چنانچہ ممتاز شیعہ عالم شمس العلماء علامہ سید علی الحائری نے 28 جنوری 1923ء کو ایک مجلس عزا سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:۔

"صاحبان! اب استجابت دعا کا وقت ہے۔ بعد از دعائے خاتمہ بالخیر کے آپ لوگوں کا فرض ہے کہ اس مذہبی آزادی کے قیام و دوام کے لئے صدق دل سے آمین کہیں کیونکہ فی الحقیقت آپ بہت ہی ناشکر گزار ہوں گے اگر آپ اس کا اعتراف نہ کریں کہ ہم کو ایسی سلطنت کے زیر سایہ ہونے کا فخر حاصل ہے جس کی عدالت اور انصاف پسندی کی مثال اور نظیر دنیا کی کسی سلطنت میں نہیں مل سکتی۔ فی الواقعہ بادشاہ وقت کے حقوق میں سے ایک اہم حق یہ ہے کہ رعایا اپنے بادشاہ وقت کی شکر گزاری میں ہمیشہ رطب اللسان رہے"۔۔۔

"اسی ہندوستان میں گذشتہ غیر مسلم سلطنتوں کے عہد میں یہ حالت تھی کہ مسلمان اپنی مسجدوں میں اذان تک نہیں کہہ سکتے تھے اور باتوں کا تو ذکر ہی کیا' حلال چیزوں کے کھانے سے روکا جاتا تھا۔ کوئی باقاعدہ تحقیق نہ ہوتی تھی مگر یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج ہم ہندوستان میں ایسی مبارک مہربان سلطنت کے تحت عدالت و انصاف ہیں کہ ---- جس کا قانون ہے کہ سب مذاہب آزادی کے ساتھ اپنے مذہبی فرائض کو ادا کریں لہٰذا اس سلطنت کے وجود و بقا اور قیام و دوام کے لئے تمام احباب دعا کریں اور اس ایثار کا جو وہ اہل اسلام اور اور خاص کر شیعوں کی تربیت میں بے دریغ مرعی رکھتی ہے ہمیشہ صدق دل سے شکر گزار رہیں اور اس کے ساتھ دل سے وفادار رہنا اپنا شعار بنالیں اور اس کے خلاف جلسوں اور مظاہروں میں شریک اور معین ہونے سے قطعاً "احتراز کریں"۔ (7)

علامہ علی الحائری نے اپنی اس تقریر میں عادل حاکم وقت کی اطاعت کرنے کی ہدایت ذاتی حیثیت سے نہیں کی بلکہ مولانا نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد مبارک سے استدلال فرمایا کہ مسلمانوں کو رسولؐ خدا کی پیروی کرنی چاہیئے کیونکہ آں حضرتؐ نے نوشیروان عادل کے عہد سلطنت میں ہونے کا ذکر مدح اور فخر کے رنگ میں فرمایا اس لئے مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ بھی رسولؐ کریم کی پیروی میں "اپنی عادل گورنمنٹ کے احسانوں کے شکر گزار رہیں"۔

علامہ حائری کہنا یہ چاہتے ہیں کہ رسولؐ اکرم کے دل میں نوشیروان عادل کی اتنی قدر تھی کہ حضورؐ فرماتے تھے کہ اگر میں نوشیروان عادل کے عہد حکومت میں ہوتا تو اس پر فخر کرتا (یہ الفاظ خود علامہ حائری کے ہیں اصل کتاب میں ملاحظہ فرمایئے)

یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ علامہ حائری ایک درویش صفت عالم تھے انہیں مال و منال کی حرص تھی نہ عہدہ و منصب کی' نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے کہ انہوں نے دنیا کی خاطر دین کو فروخت کر دیا۔ پھر انہوں نے کیوں حکومت برطانیہ کی حمایت و وفاداری کا درس دیا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ شرعاً" اور مذہباً" ایسی حکومت کے خلاف بغاوت ناجائز ہے جس میں مسلمان امن و اماں سے زندگی گذار رہے

ہوں اور ان کے دینی معاملات میں مداخلت بھی نہ کی جا رہی ہو۔ یہ مولانا کا مذہبی اور دینی نظریہ تھا۔ یہی موقف سرسید احمد خاں اور ان کے بعض معاصرین کا تھا۔ پھر انہیں انگریزوں کا ایجنٹ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ایجنٹ تھے تو اس الزام سے کون بچ سکتا ہے۔

حواشی:

1-2 قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ 351 مولفہ سید کمال الدین حیدر حسینی المشہدی۔ مطبع نامی منشی نو لکشور حضرت گنج لکھنؤ ماہ ستمبر 1896ء

3- قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ 351

4- قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ 449 و صفحہ 450

5- ظفر نامہ و قائع غدر (قلمی) کتاب فارسی میں ہے۔ "جنگ آزادی 1857ء" کے مولف نے اپنی کتاب کے صفحہ 226 پر اصل فارسی عبارت درج کر دی ہے۔ راقم الحروف نے اس کا اردو ترجمہ کر دیا ہے۔ (پیام)

6- تذکرۃ الرشید صفحہ 76

7- موعظہ تقیہ صفحہ 64 تا صفحہ 66 از سرکار شمس العلماء علامہ سید علی الحائری قبلتہ۔ شائع کردہ کتب خانہ حسینیہ حلقہ نمبر 72 لاہور۔ محلہ شیعاں موچی دروازہ

علمائے اہلحدیث کا جہاد

اہل دیوبند اور اہل تشیع کے بعد مسلمانوں کا دوسرا بڑا مکتبۂ فکر وہ ہے جسے اہل حدیث کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس مکتبۂ فکر کے ممتاز علماء میں شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین دہلوی اور مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے بہت شہرت حاصل کی اور ان کے ہزاروں شاگرد جو خود بڑے جید عالم تھے اکناف ہند میں پھیلے ہوئے تھے۔ 1857ء کی بغاوت کے دوران شیخ مولانا سید نذیر حسین دہلی میں موجود تھے۔ باغیوں نے جبرا" ان سے جہاد کے حق میں ایک فتوے پر دستخط کروا لئے تھے۔ اسی جرم میں مولانا کو گرفتار کیا گیا۔ کچھ دن راولپنڈی جیل میں بھی مقید رہے مگر جب ثابت ہو گیا کہ موصوف باغیوں کے شریک کار نہیں تھے بلکہ جان کے خوف سے انہیں اس فتوے پر دستخط کرنے پڑے تھے تو انہیں رہائی مل گئی۔

مولانا سید نذیر حسین نے باقی زندگی انگریزوں کے زیر سایہ امن و عافیت سے بسر کی اور اپنے معتقدین کو حکومت برطانیہ کی وفاداری کا درس دیتے رہے۔ کسی ذاتی فائدے کی خاطر نہیں کہ ان جیسے جید عالم اور شیخ الکل کے بارے میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا صرف اس لئے کہ ان کے نزدیک مسئلے کی صورت ہی یہ تھی۔

مولانا سید نذیر حسین کا فتویٰ

انہی دنوں یاغستان میں انگریزوں کے خلاف ایک مسلح تحریک جاری تھی۔ علاقہ غیر میں مقیم ہندوستان کے حریت پسند انگریزوں کے علاقے میں آکر سرکاری فوج پر حملے کرتے اور کامیاب چھاپے مار کر واپس چلے جاتے۔ مولوی عبداللہ صاحب ان کے

امیر تھے۔ ایک سائل نے مولانا سید نذیر حسین صاحب سے سوال کیا کہ مولوی عبداللہ صاحب جو علاقہ خراسان میں ہیں وہ امام وقت ہیں یا نہیں؟ سوال کرنے والے کا مدعا یہ تھا کہ اگر مولوی عبداللہ صاحب امام وقت ہیں تو ان کی قیادت میں جہاد فرض ہو جاتا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں پر ان کی اطاعت اور امداد بھی فرض ہو جاتی ہے۔ مولانا سید نذیر حسین صاحب نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا کہ:۔

"الجواب۔ جاننا چاہیئے کہ امام اکبر یعنی امیرالمومنین جس کے اختیار میں انتظام سارے مومنوں کا ہوتا ہے اس کی اطاعت فرض ہے (مگر) اس میں کئی شرطیں ضرور ہیں کہ جب وہ شرطیں پائی جاویں گی وہ امام وقت شرعا" ہو گا ورنہ نہ ہو گا"۔

اس کے بعد مولانا نے متعدد احادیث سے ثابت کیا ہے کہ امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ قریش میں سے ہو قریش کے سوائے کسی کی امامت جائز نہیں۔ فتوے کے آخر میں مولانا فرماتے ہیں کہ "اب میں کہتا ہوں کہ مولوی عبداللہ جو علاقہ خراسان میں ہیں بسبب فقدان شرط اول کے یعنی قریشی نہ ہونے کے امام نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ انصاری ہیں"۔ (1)

مولانا سید نذیر حسین جانتے تھے کہ ان کے اس فتوے سے یاغستان کی "تحریک مجاہدین" پر زد پڑے گی اور جو لوگ ان کا فتویٰ پڑھیں گے وہ مجاہدین کی امداد سے دست کش ہو جائیں گے کیونکہ جب ان کا سربراہ (امیر) ہی شرعا" امام نہیں تو اس کی اطاعت اور امداد کیا معنی۔ مگر مولانا نے سیاسی اور وقتی مصلحتوں کی پروا نہ کی اور وہی فتویٰ دیا جو ان کے نزدیک شرعا" درست تھا۔

شرائط جہاد

سائل نے دوسرا سوال یہ کیا تھا کہ جہاد فرض میں سے ہے یا کفایہ اور اس وقت جہاد ہے یا نہیں۔ اس کے جواب میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "جاننا چاہئے کہ جہاد فرض کفایہ ہے ۔۔۔ مگر جہاد کی کئی شرطیں ہیں جب تک وہ نہ پائی جائیں گی جہاد نہ ہو گا"۔
اس کے بعد مولانا جہاد کی شرائط بیان کرتے ہیں۔

(1) جہاد کے لئے ضروری ہے کہ مسلمانوں کا کوئی امام وقت و سردار ہو۔ بخاری و مسلم سے صراحتہ "یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جہاد امام کے پیچھے ہو کے کرنا چاہیئے بغیر امام کے نہیں۔

(2) دوسری شرط جہاد کی یہ ہے کہ (مجاہدین کے پاس) اسباب لڑائی کا مثل ہتھیار وغیرہ کے مہیا ہو جس سے کفار کا مقابلہ کیا جاوے۔ ظاہر ہے کہ (جیش مجاہدین) بغیر ہتھیار کے کیا کرے گا۔

(3) تیسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا کوئی قلعہ یا ملک جائے امن ہو۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے جب تک مدینہ میں ہجرت نہ کی اور مدینہ جائے پناہ نہ ہوا جہاد فرض نہیں ہوا یہ صراحتہ" دلالت کرتا ہے کہ جائے امن ہونا بہت ضروری ہے۔

(4) چوتھی شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کا لشکر اتنا ہو کہ کفار کے مقابلہ میں مقابلہ کر سکتا ہو یعنی کفار کے لشکر کے آدھے سے کم نہ ہو۔ یہ شرائط بیان کرنے کے بعد مولانا سید نذیر حسین فرماتے ہیں کہ "پس جب یہ بات بیان ہو چکی تو میں کہتا ہوں کہ اس زمانے میں ان چار شرطوں میں سے کوئی شرط موجود نہیں تو کیونکر جہاد ہو گا۔ ہرگز نہیں"۔ (2)

سرکار انگریزی سے جہاد جائز نہیں

مولانا سید نذیر حسین نے جہاد کی شرائط کی وضاحت کرنے کے بعد ایک عام اصول اور قرآن و حدیث کی رو سے اسلامی نقطہ نظر بیان کر دیا کہ موجودہ عہد میں جہاد جائز نہیں کیونکہ شرائط جہاد پوری نہیں ہوتیں۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مولانا نے بات بالکل صاف کر دی تاکہ کسی کو یہ اشتباہ پیدا نہ ہو کہ موصوف ایک عام اصول بیان کر رہے ہیں جس کا اطلاق ہندوستان کے حالات پر نہیں ہوتا۔ چنانچہ مولانا نے اس اشتباہ کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ:۔

"علاوہ بریں ہم لوگ معاہد ہیں۔ سرکار سے عہد کیا ہوا ہے۔ پھر کیوں کر عہد کے خلاف کر سکتے ہیں۔ عہد شکنی کی بہت مذمت حدیث میں آئی ہے"۔ (3)

یعنی شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین دہلوی کی رائے میں جسے وہ قرآن و حدیث پر مبنی قرار دیتے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا اپنی حکومت کے خلاف جہاد ناجائز ہے اور رسول اقدس صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات کی رو سے قابل مذمت ہے کیونکہ ہندوستان کے مسلمان اپنی حکومت سے وفاداری کا عہد کر چکے ہیں اور عہد شکنی گناہ ہے۔

اس فتوے پر شیخ الکل کے علاوہ 14 مفتیان عظام کے دستخط ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنے بڑے بڑے علماء دانستہ ضلالت و گمراہی کا فتویٰ تو نہیں دے سکتے تھے۔ یہی "قصور" سرسید احمد خاں کا تھا' ان کے بعض معاصرین کا تھا۔ اسی "جرم" میں ان بزرگوں کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا گیا اور ان پر الزام لگایا گیا کہ ان لوگوں نے مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کا جذبہ نکال پھینکا اور قوم کو انگریز کی غلامی پر رضامند کیا۔ اگر یہ "جرم" تھا تو اس "جرم" میں وہ تمام لوگ شریک ہیں جو علم دین کی عظمت سمجھے جاتے ہیں۔ ان بزرگوں کے مقابلے میں سرسید احمد خاں کی دینی حیثیت صفر کے برابر تھی۔ ان کی رائے سے کوئی دیندار شخص متاثر نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ سرسید احمد خاں نہ عالم دین ہونے کے مدعی تھے نہ صاحب افتا۔ مگر علمائے دیوبند' علمائے شیعہ اور علمائے اہلحدیث تو لاکھوں مسلمانوں کے پیشوا تھے۔ ان کا شمار ممتاز علماء اور مفتیوں میں ہوتا تھا۔ ان کی رائے لاکھوں مسلمانوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔ یہ اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں سے اگر جہاد کا جذبہ نکل گیا اور وہ انگریزوں کی اطاعت پر رضامند ہو گئے تو اس میں سرسید احمد خاں کا حصہ زیادہ ہے یا علمائے اہل تشیع' علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث کا؟

امتناع جہاد کے سلسلے میں مولانا سید نذیر حسین کی مساعی جمیلہ کا ذکر کرتے ہوئے ایک اور فتویٰ مل گیا ہے وہ بھی درج ہو جائے تو بات ہر پہلو سے مکمل ہو جائے۔ ایک سائل نے سوال کیا کہ "کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلے میں کہ ہندوستان میں جہاد جائز ہے یا نہیں" شیخ الکل تحریر فرماتے ہیں:۔

"الجواب:۔ ارباب شریعت غرا پر مخفی نہیں کہ شرط مباح جہاد کے واسطے دو امر

لابدی ہیں ایک فقدان امن و اماں و عہد و پیاں درمیان اہل اسلام و مقابلین کے۔ دوم شوکت و قوت و قدرت سلاح و آلات جہاد پر"۔

یعنی جہاد کے جواز کے لئے دو لازمی شرائط ہیں۔ ایک یہ کہ امن و امان کا وجود نہ رہے اور مسلمانوں اور ان کی مدمقابل طاقت کے درمیان کوئی عہد و پیاں نہ ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ مسلمانوں کے پاس قوت ہو اور جہاد کرنے کے لئے ضروری اسلحہ موجود ہو۔ اس کے بعد مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ "اور ہندوستان میں شوکت و قوت و قدرت سلاح و آلات مفقود ہے اور ایمان و پیاں یہاں موجود ہے پس جب کہ شرط جہاد کی اس دیار میں معدوم ہوئی تو جہاد کرنا یہاں سبب ہلاکت اور معصیت کا ہو گا"۔ (4)

شیخ الکل کے فتوے کی رو سے چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کے پاس نہ قوت و شوکت ہے نہ آلات جنگ ہیں اور وہ حکومت برطانیہ سے وفاداری کا عہد و پیاں کر چکے ہیں اس لئے ان پر جہاد فرض نہیں بلکہ جو مسلمان جہاد کرے گا اس کی موت ہلاکت کی موت ہو گی اور وہ گناہ گار ہو کر مرے گا یعنی لڑائی میں شکست بھی ہو گی اور موت بھی ہلاکت اور معصیت کی۔ سر سید احمد خاں اس قسم کا مدلل فتویٰ دینے کے نہ مجاز تھے نہ انہوں نے دیا۔ اس کا حق انہی حضرات کو حاصل تھا جو وارث علوم اسلامیہ تھے اور انہوں نے یہ حق بے خوف و خطر اور کسی ترغیب و تحریص کے بغیر اپنا ایک دینی فریضہ سمجھ کر استعمال کیا۔

ملکہ وکٹوریہ کا جشن جوبلی اور اہل حدیث

شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین کے ان فتاویٰ کو ان کی ذاتی رائے قرار دیا جا سکتا ہے لیکن جماعت اہل حدیث نے من حیث الجماعت حکومت برطانیہ سے جس وفاداری کا اظہار کیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اکابر اہل حدیث صدق دل سے یقین رکھتے تھے کہ انگریزوں کی حکومت ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتی ہے، ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرتی اس لئے حکومت کی اطاعت ان پر فرض ہے۔ اس کا اظہار جماعت نے مختلف مواقع پر کیا۔ چنانچہ 1886ء میں ملکہ وکٹوریہ

کی حکومت کا جشن پنجاہ سالہ (گولڈن جوبلی) سرکاری طور پر منایا گیا۔ حکومت نے کوئی قانون نافذ نہیں کیا کہ جو شخص "ملکہ عالیہ" کا جشن جوبلی نہیں منائے گا وہ تعزیرات ہند کی فلاں اضافی دفعہ کی رو سے اتنی سزا کا مستوجب ہو گا۔ اس کے باوجود جماعت اہل حدیث لاہور نے اس جشن میں شرکت کی۔ ملکہ عالیہ کی درازی عمر اور ان کی حکومت کی توسیع کے لئے دعا کی، عوام و خواص کی پر تکلف دعوت کی اور مقام دعوت کو چراغاں سے بقعہ نور بنا دیا۔ جماعت اہل حدیث کے ترجمان "اشاعۃ السنہ" میں اس جشن کی روداد شائع کی گئی جس کے بعض اقتباسات درج ذیل ہیں۔

"اہل حدیث لاہور نے جشن جوبلی کی تقریب پر کمال مسرت ظاہر کی اور قیصرہ ہند (ملکہ وکٹوریہ) کی پنجاہ سالہ حکومت کی خوشی میں اہل اسلام کی مکلف ضیافت کی جس میں رؤسا، شرفا، علماء و عام اہل اسلام رونق افروز ہوئے۔ مولوی الٰہی بخش صاحب وکیل کی وسیع کوٹھی کے دو کمرے رئیسوں وغیرہ خواص کے لئے مخصوص تھے باقی سات کمرے عوام اہل اسلام کے لئے مقرر تھے (دستر خوان پر امیر و غریب کی یہ تفریق سمجھ میں نہیں آئی۔ مولف) اور کھانا سب کے آگے امیر تھے خواہ فقیر، رئیس تھے خواہ غیر رئیس، یکساں پلاؤ زردہ، قورما پیش کیا گیا۔ 8 بجے صبح سے ٹھیک 12 بجے تک ان صاحبوں کو کھانا کھلایا گیا جن کو ٹکٹوں کے ذریعے سے بلایا گیا تھا۔ اس کے بعد چار بجے تک عام اہل اسلام مساکین و فقراء کو کھانا کھلایا گیا۔ آخری جماعت کو کچھ نقد بھی ملا"۔ (5) اس روداد کے مطابق اس اجتماع اور دعوت طعام میں قیاساً "سات آٹھ ہزار اشخاص شریک ہوئے۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی مگر انہوں نے معذرت کر دی ساتھ ہی اظہار مسرت و ممنونیت فرمایا۔ ملکہ عالیہ کی خدمت میں یہ خراج تحسین اور نذرانہ عقیدت تنہا جماعت اہل حدیث کا نہ تھا بلکہ جماعت نے اسے زیادہ سے زیادہ نمائندہ اجتماع بنانے کے لئے اپنے ساتھ انجمن حمایت اسلام، انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن ہمدردی اسلام کو بھی شریک کر لیا۔ (6) چنانچہ ان انجمنوں کے صدور معتمدین اور بکثرت اراکین نے شرکت کی۔ (7)

جس مقام پر یہ دعوت ہوئی اس کے "عین دروازہ کے سامنے سے رات کے

وقت ملاحظہ روشنی کے لئے نواب لیفٹیننٹ گورنر بہادر کا گزر کرنا مقرر تھا اس جگہ اہل
حدیث نے ایک بلند اور وسیع دروازہ بنایا جس پر سنہری حرفوں میں ایک طرف انگریزی
میں یہ کلمات دعائیہ مرقوم تھے۔

THE AHL-E- HADIS WISH EMPRESS A LONG LIFE

ترجمہ۔ اہل حدیث چاہتے ہیں کہ قیصرہ ہند کی عمر دراز ہو۔ دوسری طرف
لاجوردی رنگ سے یہ بیت اردو۔

"دل سے ہے دعائے اہل حدیث   جشن جوبلی مبارک ہو"۔

ملکہ عالیہ کے اس جشن جوبلی کے موقعہ پر گورنمنٹ ہاؤس میں ایک تقریب
منعقد ہوئی جس میں سرکار برطانیہ کے وفاداروں کی طرف سے سپاسنامے پیش کئے گئے
اور اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا گیا۔

جماعت اہل حدیث کا ملکہ وکٹوریہ کو ایڈریس

جماعت اہل حدیث کے ترجمان "اشاعۃ السنۃ" کے مطابق گورنر صاحب کی
خدمت میں جو ایڈریس پیش ہوئے ان میں اہل حدیث کا نمبر دسواں تھا۔ یہ ایڈریس
جماعت کے ڈیپوٹیشن نے پیش کیا اس ڈیپوٹیشن میں چھ افراد شریک تھے۔ سرفہرست
ابوسعید مولانا محمد حسین بٹالوی کا اسم گرامی تھا۔ ان کے علاوہ ہندوستان کے مختلف
صوبوں پنجاب، بمبئی، مدراس و بنگال وغیرہ کے اکابر اہل حدیث کے دستخط ثبت تھے۔ گویا
یہ ایڈریس صرف لاہور یا پنجاب کی جماعت اہل حدیث کی طرف سے نہیں بلکہ
ہندوستان بھر کے اہل حدیث حضرات کی طرف سے تھا۔ ایڈریس کے چند اقتباسات:۔

"ایڈریس گروہ مسلمانان اہل حدیث"

بحضور فیض گنجور کوئین وکٹوریہ ملکہ گریٹ برٹن و قیصرہ ہند بارک اللہ فی
سلطنتھا

ہم ممبران گروہ اہل حدیث اپنے گروہ کے کل اشخاص کی طرف سے حضور والا
کی خدمت عالی میں جشن جوبلی کی دلی مسرت سے مبارکباد عرض کرتے ہیں۔۔۔ برٹش

رعایائے ہند میں سے کوئی فرقہ ایسا نہ ہو گا۔۔۔۔ جس کے بال بال سے صدائے "
مبارکباد نہ اٹھتی ہو گی مگر خاص کر فرقہ اہل حدیث جس کو سلطنت کی اطاعت اور فرماں
روائے وقت کی عقیدت اس کا مذہب سکھاتا اور اس کو ایک مذہبی فرض قرار دیتا ہے علی
الخصوص اور بھی سبقت رکھتا ہے" (خلاصہ مولف) "کیونکہ جن برکتوں اور نعمتوں کی
وجہ سے یہ ملک تاج برطانیہ کا حلقہ بگوش ہو رہا ہے ازاں جملہ ایک بے بہا نعمت مذہبی
آزادی ہے یہ گروہ ایک خصوصیت کے ساتھ اپنا نصیبہ اٹھا رہا ہے۔ وہ خصوصیت یہ ہے
کہ مذہبی آزادی اس گروہ کو خاص کر اسی سلطنت میں حاصل ہے۔۔۔۔ اس گروہ کو
اس سلطنت کے قیام و استحکام سے زیادہ مسرت ہے۔۔۔۔ ہم بڑے زور سے دعا مانگتے
ہیں کہ خداوند تعالیٰ حضور والا کی حکومت کو اور بڑھائے اور تادیر حضور کا نگہبان رہے
تاکہ حضور والا کی رعایا کے تمام لوگ حضور کی وسیع حکومت میں امن اور تہذیب کی
برکتوں سے فائدہ اٹھا سکیں"۔ (9)

اس ایڈریس میں جماعت اہل حدیث کی طرف سے ملکہ عالیہ کی خدمت میں جو
بنیادی نکتہ پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "اس جماعت کو صرف اور صرف حکومت برطانیہ
کے زیر سایہ مذہبی فرائض ادا کرنے کی آزادی حاصل ہے دوسری مملکتوں حتی کہ اسلامی
مملکتوں میں بھی یہ آزادی حاصل نہیں"۔

گویا جماعت اہل حدیث ملکہ معظمہ کی تعریف کسی ذاتی مفاد کے تحت نہیں کر
رہی تھی، سرکار انگریزی سے اپنی وفاداریوں کا اظہار کر کے درہم و دینار حاصل کرنا
جماعت کے پیش نظر نہ تھا بلکہ جماعت کو جو مذہبی آزادی حاصل تھی اس پر اپنی غیر
متعصب گورنمنٹ کا شکریہ ادا کر رہی تھی۔

سرسید احمد خاں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے سے حکومت برطانیہ
کی حمایت بھی اسی لئے کی تھی کہ ڈیڑھ سو سال کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کو پرامن
اور آبرومندانہ زندگی گزارنے کا موقع اسی حکومت کے زیر سایہ ملتا تھا۔ سرسید چاہتے
تھے کہ 1857ء کے اندوہناک سانحے کی وجہ سے انگریزوں کے دل میں مسلمانوں کے
بارے میں جو شکوک و شبہات پیدا ہو گئے ہیں وہ دور ہو جائیں اور مسلمانوں کو بھی

دوسرے اہل وطن کے ساتھ ترقی کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہو جائیں۔ اس لحاظ سے سرسید احمد خاں اور جماعت اہل حدیث دونوں کا ایک ہی نصب العین اور اس کے حصول کا طریق کار بھی ایک ہی تھا۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ اہل حدیث حریت پسند؟ اور غریب سرسید انگریزوں کا ایجنٹ؟

گورنر پنجاب کی خدمت میں اہل حدیث کا ایڈریس

مارچ 1887ء میں پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مسٹر ایچی سن اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گئے۔ اس موقع پر جماعت اہل حدیث نے سرکار برطانیہ سے ایک بار پھر اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ گورنر صاحب کی خدمت میں نہ صرف خود بلکہ بعض اور اسلامی انجمنوں کی طرف سے الوداعی سپاسنامہ پیش کیا۔ یہ ایڈریس 24 مارچ 1887ء کو گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں گورنر ایچی سن کے حضور نذر کیا گیا۔ سپاسنامے میں گورنر صاحب کے 8 احسانات کا اعتراف کیا گیا ہے۔ جو مسلمانوں پر کئے گئے۔ ان میں سے ایک احسان یہ تھا کہ:۔

”حضور نے مسلمانوں کے ایک گروہ اہل حدیث۔۔۔ کی نسبت لفظ وہابی کے استعمال کو مسدود فرمایا اور سرکاری کاغذات میں اس کے استعمال سے ممانعت کا حکم نافذ کیا“۔

ایڈریس میں لفظ وہابی کو اس لئے جماعت اہل حدیث کے لئے دل آزار قرار دیا گیا تھا کہ اس سے جماعت کی ”وفاداری و جاں نثاری میں جو نازک وقتوں پر ہو چکی اور گورنمنٹ کے نزدیک ثابت و مسلم ہے ناواقفوں کو شبہ ہوتا تھا“۔ (10)

ان الفاظ سے اندازہ ہوتا ہے کہ جماعت اہل حدیث سرکار برطانیہ کی قدیمی خیر طلب اور وفادار جماعت تھی اور بہت سے نازک مواقع پر اس نے اپنی حکومت کے لئے جاں نثاری کا مظاہرہ کیا۔ اسی لئے جماعت کو اپنے لئے لفظ وہابی کا استعمال بھی پسند نہیں تھا کیونکہ اس سے ناواقفوں کو شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید جماعت انگریزوں کی دشمن ہے اور ان کے اقتدار کا خاتمہ چاہتی ہے۔ اس ایڈریس میں اس کی تردید کی گئی ہے اور اس امر پر

افسوس کا اظہار کیا گیا ہے کہ:۔

”ہم بہت جلد حضور کے آئندہ مربیانہ عنایات سے محروم ہونے والے ہیں۔ ہم باشندگان پنجاب خصوصاً“ اہل اسلام علی الخصوص اہل حدیث کو جس قدر حضور کی مفارقت کا افسوس ہے اس کے پورے اظہار کے لئے کافی الفاظ نہیں پاتے۔۔۔ خداوند عالم حضور فیض گنجور کو صحت و سلامتی کے ساتھ وطن مالوف میں پہنچائے اور پھر بہت جلد حضور کو عہدہ گورنر جنرل پر مامور و معزز فرما کر ہندوستان میں لاوے اور ہماری آنکھوں کو دوبارہ حضور کے دیدار کے فیض آثار سے منور کرے آمین ثم آمین۔

بوطن رفتنت مبارک باد بسلامت روی و باز آئی“ (11)

انگریزوں کی تعریف اور حمایت سرسید احمد خاں نے بھی کی اور جماعت اہل حدیث نے بھی مگر جماعت اہل حدیث ایک معاملے میں سرسید پر سبقت لے گئی۔ یعنی سرسید نے انگریزوں کو نور قرار نہیں دیا ان کی تعریف تو کی، سلطنت برطانیہ کی برکات بھی گنوائیں مگر کسی گورنر یا گورنر جنرل کے چہرے کو پرانوار قرار دے کر اپنی آنکھوں کو اس سے منور نہیں کیا نہ اس قسم کی دعا کی مگر جماعت اہل حدیث نے گورنر ایچی سن کے فیض دیدار کو آنکھوں کا نور قرار دیا۔ اگر کوئی اسے خوشامد کی انتہا قرار دے تو یہ اس کی صریح غلطی ہے۔ عالم اور دین دار لوگ چونکہ خود نورانی قلب رکھتے ہیں اس لئے انہیں وہ لوگ بھی نورانی نظر آتے ہیں جن پر ان کی نگاہیں پڑتی ہیں اور پھر محسنوں کے چہرے تو خصوصیت سے پرانوار بن جاتے ہیں۔ یہ معاملات تصوف ہیں عامی انہیں کیا جانیں عزیزان گرامی! یہ کوچہ ہی اور ہے۔

مولانا محمد حسین بٹالوی اور جہاد

جماعت اہل حدیث کی دوسری بڑی شخصیت ابو سعید مولانا محمد حسین بٹالوی کی تھی جو شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید اور اپنے زمانے کے ممتاز عالم تھے۔ اہل حدیث کے ترجمان ”اشاعۃ السنۃ“ کے ایڈیٹر اور اہل حدیث کے وکیل تھے۔ مولانا کا علمی مقام ہر شک و شبہ سے بالا ہے۔ ان کے فیض یافتہ ملک کے طول و

عرض میں پھیلے اور اپنے فاضل استاد کا نام روشن کیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی نے جہاد کے موضوع پر ایک رسالہ لکھا جو پہلے بالاقساط "اشاعۃ السنۃ" میں شائع ہوا۔ اس رسالے میں جو "الاقتصاد فی مسائل الجہاد" کے نام سے موسوم ہے بٹالوی مرحوم نے جہاد اور شرائط جہاد پر مدلل بحث کی اور لکھا کہ:۔

"اس زمانے میں بھی شرعی جہاد کی کوئی صورت نہیں ہے کیونکہ اس وقت نہ کوئی مسلمانوں کا امام موصوف بصفات و شرائط امامت موجود ہے اور نہ ان کو ایسی شوکت و جمعیت حاصل ہے جس سے وہ اپنے مخالفوں پر فتحیاب ہونے کی امید کر سکیں۔ ہم جب کبھی بعض اخبارات میں یہ خبر دیکھتے ہیں کہ سلطنت روم یا ریاست افغانستان وغیرہ بلاد اسلام سے جہاد کا اشتہار دیا گیا ہے تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور اس خبر کا یقین نہیں آتا اور یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس وقت روئے زمین پر امام کہاں ہے جس کی پناہ میں اور اس کے امر و اجازت سے مسلمان جہاد کر سکیں اور ایسی جمعیت و شوکت کس کو میسر ہے جس سے وہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں پر فتح یاب ہونے کی امید رکھیں"۔ (12)

مولانا نے جہاد کے لئے دو شرائط بیان کیں اول یہ کہ ان کا امام موجود ہو دوم یہ کہ مسلمانوں کو ایسی شوکت و قوت حاصل ہو جس سے وہ اپنے دشمنوں پر غلبہ حاصل کر سکیں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت نہ تو مسلمانوں کا کوئی امام ہے اور نہ انہیں قوت و شوکت حاصل ہے اس لئے جہاد جائز نہیں۔ شاید موصوف کو خیال آیا کہ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ اگر مسلمانوں نے کسی کو امام بنا لیا یا وہ کہیں سے نازل ہو گیا اور انہوں نے قوت و شوکت حاصل کر لی تو جہاد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ چنانچہ انہوں نے اس مغالطے کو بھی دور کر دیا' فرمایا:۔

"مسلمانان ہند کو موجودہ سلطنت کے ظل حمایت میں مذہبی آزادی پوری حاصل ہے اس حالت پر نہ مسلمانوں کو اپنے دین کے نقصان یا گناہ کا خوف کرنا چاہیئے اور نہ ان کے حاکم وقت برٹش گورنمنٹ کو ان کی طرف سے یہ خوف رکھنا چاہیئے کہ وہ پنی اس حالت کو نقصان و گناہ کی حالت سمجھ کر اس حالت کو بدلانے اور اپنے لئے کوئی

امام یا سامان جہاد بہم پہنچانے میں سعی کریں گے اور کبھی نہ کبھی گورنمنٹ کے مخالف ہو جائیں گے۔ یہ خوف فریقین کا اس وقت بجا تھا جب کہ جہاد اسلام کا اصلی فرض ہوتا اور تقرر امام کے سوا مسلمانوں کا اسلام صحیح یا کامل نہ ہوتا"۔ (13)

مولانا محمد حسین بٹالوی نے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ مسلمانوں کا حکومت برطانیہ کے خلاف جہاد کرنے کا کوئی ارادہ ہے یا وہ کسی امام کی تلاش میں ہیں اور سامان جنگ و جہاد کی فراہمی میں کوشاں ہیں۔ ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے بقول صاحب موصوف جہاد اسلام کا فرض اصلی نہیں ہے اور امام کے تقرر کے بغیر بھی مسلمانوں کا دین صحیح اور کامل ہے۔

آخر میں مولانا محمد حسین بٹالوی نے مسلمانان ہند کو نصیحت فرمائی کہ "اسلام کے سچے پیروکاروں کا یہ کام نہیں کہ اختلاف مذہب کی بنا پر فریق مخالف سے لڑیں ان کو زبردستی مسلمان بنائیں بزور شمشیر اسلام پھیلائیں یا غیر مسلم سلطنت میں رہتے ہوئے اس کی اطاعت سے انکار کریں یا اس کے خلاف بغاوت وغیرہ کا خیال دل میں لائیں"۔ (14)(ملخص)

کیا جہاد کے جواز عدم جواز کے بارے میں اس سے زیادہ زوردار اور مدلل مضمون اس موضوع پر لکھا جا سکتا ہے یا کسی مسلمان عالم کو لکھنے کی توفیق ہوئی؟ اس کا جواب نفی میں ہو گا۔ ایک نکتہ یا ایک پہلو مسئلہ جہاد کا مولانا محمد حسین بٹالوی نے ایسا بھی بیان کر دیا جو سرسید احمد خاں کو بھی نہ سوجھا ہو گا کیونکہ بقول ایک ناقد سید مرحوم کی" تعلیم متوسط کتابوں سے آگے نہیں بڑھی تھی"۔ (15) (مرحوم ایم اے یا پی ایچ ڈی بھی نہیں کر سکے تھے) مگر مولانا محمد حسین بٹالوی سرسید سے کہیں اونچے پائے کے عالم' محقق اور مفتی تھے۔ اسی علم و تحقیق نے مولانا کے ذہن و فکر کو وسعت عطا کی۔ سرسید احمد خاں نے اپنا سارا زور قلم ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار اور اطاعت گزار بنانے پر صرف کر دیا۔ اس سے آگے کی انہیں نہ سوجھی مگر مولانا محمد حسین بٹالوی دور رس نگاہ رکھتے تھے اور برطانوی مفادات کا عالم گیر تصور ان کے ذہن میں تھا چنانچہ موصوف نے ان نادان مسلمانوں پر تعجب کا اظہار کیا جو بلاد اسلامیہ مثلاً افغانستان اور

روم میں آباد ہیں کہ ان کی طرف سے "جب کبھی جہاد کا اشتہار دیا جاتا ہے تو ہم کو سخت تعجب ہوتا ہے اور اس خبر کا یقین نہیں آتا" _ (16) کہ وہ ایسی حماقت کریں گے یعنی انگریزوں سے لڑنے کی تیاری اور جہاد کا انتظام کریں گے۔ دوسرے الفاظ میں مولانا نے صرف ہندوستان کے مسلمانوں کو انگریزوں کے خلاف جہاد سے نہیں روکا بلکہ روم اور افغانستان کے مسلمانوں کو بھی مشورہ دیا کہ انگریزوں سے جہاد کرنے کی کوشش مت کرو۔ اس کی وجوہ دو بیان کیں اول اس وقت مسلمانوں کا کوئی امام موجود نہیں۔ دوم مسلمانوں کے پاس اتنی طاقت نہیں کہ وہ کفار پر فتح پا سکیں اس لئے ان سے خوشگوار تعلقات رکھو اسی میں تمہاری اور تمہارے دین کی فلاح ہے۔ گویا یہاں بھی مولانا محمد حسین بٹالوی نے جو نکتہ پیش نظر رکھا وہ مسلمانوں کی فلاح اور اسلام کا تحفظ تھا کوئی ذاتی غرض نہ تھی۔

مولانا محمد حسین بٹالوی پر انگریزوں کی مہربانی

سرسید احمد خاں کے ایک ناقد نے لکھا ہے کہ "جب غداران وطن کو ان کی کارگزاریوں کا صلہ دینے کا وقت آیا تو ایک جاں نثار وطن کی جائداد سرسید کو بھی پیش کی گئی لیکن انہوں نے جاگیر قبول کرنے کی بجائے وظیفہ کی شکل میں اپنی خدمات کا صلہ وصول کرنا چاہا یہ سرسید کی بڑی دوراندیشی تھی۔" (17)

افسوس کہ ناقد موصوف نے اتنا بھی نہ سوچا کہ سرسید کی دور اندیشی تو جب ہوتی کہ وہ وظیفہ کی بجائے جاگیر قبول کر لیتے کیونکہ وظیفہ تو کسی شخص کی زندگی تک ملتا ہے مگر جاگیر تو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہے اس میں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے اور اس سے اس شخص کی آنے والی نسلیں فائدہ اٹھاتی ہیں۔ بہرحال یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ عرض یہ کرنا ہے کہ سرسید احمد خاں کی علمی خدمات اور تعلیمی خدمات پر اگر انہیں وظیفہ دیا گیا تو اسے غداری کا صلہ کیسے کہا جا سکتا ہے؟ غداری کا صلہ تو ناقد کے بقول جاگیر کی صورت میں مل رہا تھا جسے انہوں نے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "مجھ سے زیادہ کوئی نالائق اس دنیا میں نہ ہو گا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلقہ دار بنوں۔ میں

نے اس کے لینے سے انکار کیا" _ (18)

28 دسمبر 1889ء کو سرسید احمد خاں نے ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "جب سادات کے ایک نامی خاندان کا تعلقہ جو لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا" _ (19)

سرسید احمد خاں نے تو تعلقہ اور جاگیر لینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہوں نے انگریزوں کی حمایت کسی ذاتی فائدے کی خاطر نہیں کی تھی بلکہ علمائے دیوبند، علمائے اہل تشیع اور علمائے اہل حدیث کی طرح وہ مسلمانوں کو بربادی سے بچانا چاہتے تھے اور جس طرح ان فرقوں کے علماء نے ہندوستان میں جہاد کی مخالفت اس لئے کی کہ یہاں جہاد شرعاً" درست نہ تھا بلکہ سراسر ہلاکت اور معصیت تھا اسی طرح سرسید احمد خاں کی رائے میں بھی مسلمان اس حالت میں نہ تھے کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کر سکتے۔ البتہ سرسید احمد خاں اور علمائے کرام میں ایک فرق ضرور ہے اور وہ یہ کہ سرسید احمد خاں نے اپنی خدمت کا معاوضہ جاگیر کی صورت میں وصول نہیں کیا مگر ہمارے علمائے کرام میں سے بعض کو موہبے دیئے گئے۔ ان میں سرفہرست شیخ الکل مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید اور ممتاز عالم ابو سعید مولانا محمد حسین بٹالوی ایڈیٹر "اشاعۃ السنۃ لاہور" کا نام نامی و اسم گرامی ہے۔ خود مولانا نے اس کا اعتراف کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"اراضی جو خدا تعالیٰ نے گورنمنٹ سے مجھے دلوائی ہے چار مربع ہے۔ از انجملہ دو مربعوں کی کاشت زمین و انتظام کا اختیار حافظ عبدالشکور اور اس کے بھائیوں کے سپرد رہے۔ دو مربعوں کی کاشت وغیرہ کا اختیار عبدالرشید اور اس کے بھائیوں کے سپرد رہے"۔ (20)

یہ مولانا محمد حسین بٹالوی کے وصیت نامے کا ایک اقتباس ہے جو موصوف نے اپنے رسالے میں شائع فرمایا تھا۔ مولانا ان چار مربعوں کو خداوند تعالیٰ کی بخشش قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ زمین سرکار انگلشیہ سے انہیں دلوائی۔ مولانا نے ان چار مربعوں کو کسی قومی خدمت کے لئے وقف نہیں فرمایا۔ کسی دینی

مدرسے یا اپنی جماعت کے نام اس کا کوئی حصہ منتقل نہیں فرمایا بلکہ چاروں مربعے اپنی زندگی ہی میں اپنے بیٹوں میں تقسیم فرما دیئے۔ یہاں بجا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ مربعے مولانا موصوف کو انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی خوشی میں ملے تھے؟ ظاہر ہے انگریزوں نے مولانا کو اپنا ہمدرد و بہی خواہ سمجھ کر احسان و انعام کی بارش فرمائی اور ان کے اس فعل سے اللہ تعالیٰ بھی خوش تھا کہ بقول مولانا "یہ اراضی خدا تعالیٰ نے گورنمنٹ سے مجھے دلوائی ہے"۔ پس جس سے خدا بھی خوش اور حاکم وقت بھی خوش اس کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ___ ع یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا۔

یہ اپنا اپنا نقطہ نظر اور اپنے اپنے ذوق و وجدان کی بات ہے۔ اس پر کسی قسم کا اعتراض پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی عالم کو حکومت وقت زمین یا مال عطا کرتی ہے اور یہ مال و منال قوم سے غداری کرنے کے نتیجے میں نہیں بلکہ اس کی خدمات کے صلے میں ملتا ہے تو اسے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں خصوصاً" جب کہ اس میں عنایت خداوندی بھی شامل ہے تو اس کا قبول نہ کرنا کفران نعمت ہے پس اس نقطۂ نظر سے مولانا محمد حسین بٹالوی نے یہ مربعے قبول کر کے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ اگر کیا تو سرسید احمد خاں نے کہ انہوں نے کفران نعمت کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہندوستان میں ایسے بزرگ اور عالم بھی گزرے ہیں جنہوں نے 1857ء کے ہنگامے میں یا اس کے بعد انگریزوں کی حمایت تو کی مگر ان سے ایک پیسہ یا ایک انچ زمین حاصل نہیں کی۔ انہوں نے یہ خدمت ایک دینی فریضہ سمجھ کر انجام دی۔ اس سے ان کا مقصد ذاتی فائدہ حاصل کرنا نہ تھا بلکہ مسلمانوں کو انگریزوں کے غیظ و غضب سے محفوظ رکھنا تھا یا ایک شرعی مسئلے کو اس کی صحیح صورت میں پیش کرنا۔

مولانا محبوب علی کی بے نفسی

1857ء میں دہلی کے نامور عالم مولانا محبوب علی شہر ہی میں موجود تھے۔ باغی لیڈر جنرل بخت خاں نے ان سے بھی شرکت جہاد کی درخواست کی تھی مگر انہوں نے انکار کر دیا بلکہ انگریز عورتوں کے قتل پر باغیوں کی سرزنش کی۔ ہنگامہ فرو ہونے کے بعد

باغیوں کا ساتھ نہ دینے اور انگریزوں کی حمایت کے صلے میں انہیں جاگیر پیش کی گئی یہ واقعہ "ارواح ثلاثہ" میں بیان کیا گیا ہے۔ مذکورہ کتاب مولانا اشرف علی تھانوی کی نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی تھی۔ ملاحظہ ہو۔

"غدر میں بہت علماء مخالف تھے اور کہتے تھے کہ یہ جہاد نہیں ہے۔ انہی میں (مولانا) میر محبوب علی صاحب بھی تھے اور آپ وعظ و نصیحت کے ذریعے لوگوں کو غدر سے روکتے تھے۔ جب غدر فرو ہوا تو انگریزوں کی طرف سے انہیں گیارہ گاؤں مسلم انعام میں دیئے گئے تھے اور ایک بڑا انگریز گاؤں کی معافی کا پروانہ لے کر خود مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچا اور کہا کہ گورنمنٹ نے آپ کی وفاداری کے صلے میں آپ کو گیارہ گاؤں عطا کئے ہیں اور یہ پروانہ لے کر اس انگریز کے سامنے پھاڑ ڈالا اور فرمایا کہ میں نے کیا (یہ کام) تمہارے لئے کیا؟ میرے نزدیک مسئلہ یوں ہی تھا اس لئے میں لوگوں کو منع کرتا تھا"۔ (21)

مولانا میر محبوب علی کے اس واقعے سے دو نتیجے نکلتے ہیں۔ (1) "غدر میں بہت علماء مخالف تھے کہ یہ جہاد نہیں"۔ یہ بہت سے علماء جو کثرت تعداد پر دلالت کرتے ہیں کیا غدار قوم اور دشمن اسلام تھے؟ ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔ یہ غدر کے مخالف تھے اور اس سرکشی کو جہاد قرار نہیں دیتے تھے۔ آخر کیوں؟ کیا انہیں انگریزوں نے مسلمانوں کے دلوں سے جہاد کا جذبہ نکال پھینکنے کے لئے خرید لیا تھا؟ اگر دہلی کے علماء کی اکثریت جسے "بہت سے علماء" کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اس ہنگامے کو جہاد قرار نہیں دیتی تھی تو سرسید احمد خاں کا قصور کیا تھا۔

(2) دوسری بات یہ کہ یہ علماء انگریزوں کی حمایت اور باغیوں کی مخالفت کسی ذاتی مفاد کے لئے نہیں کر رہے تھے۔ اگر مالی منفعت یا ذاتی مفاد مد نظر ہوتا تو گیارہ گاؤں کی جاگیرداری معمولی بات نہیں۔ مولانا میر محبوب علی نے اس پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہ کام گاؤں حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا بلکہ "میرے نزدیک مسئلہ ہی یوں تھا"۔ یعنی انہوں نے یہ خدمت ایک دینی فریضہ سمجھ کر انجام دی۔ کیا اس قسم کے بے نفس اور بلند پایہ علماء کے اس کردار کو جو انہوں نے

1857ء کی بغاوت میں ادا کیا، نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

حواشی:

1_ کتاب الامارۃ والجہاد۔ فتاویٰ نذیریہ جلد سوم صفحہ 282 شائع کردہ اہل حدیث اکادمی کشمیری بازار لاہور۔

2_ کتاب الامارۃ والجہاد فتاویٰ نذیریہ صفحہ 284

3_ کتاب الامارۃ والجہاد صفحہ 284

4_ کتاب الامارۃ والجہاد فتاویٰ نذیریہ صفحہ 284 وصفحہ 285

5_ اشاعۃ السنۃ النبویہ جلد نہم۔ نمبر ہفتم و ہشتم و نہم صفحہ 203 مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور

6_7 اشاعۃ السنۃ صفحہ 204_ جلد نمبر9_ نمبر7

8_ اشاعۃ السنۃ صفحہ 206 جلد نمبر9 نمبر7

9_ اشاعۃ السنۃ صفحہ 205 وصفحہ 206 جلد نمبر9 نمبر7

10_ اشاعۃ السنۃ صفحہ 255 نمبر8 جلد 9

11_ اشاعۃ السنۃ صفحہ 256 نمبر8 جلد نمبر9

12_ اقتصادی مسائل الجہاد صفحہ 72 اشاعۃ السنۃ نمبر11 جلد 9

13_ اقتصادی مسائل الجہاد صفحہ 73

14_ اقتصادی مسائل الجہاد صفحہ 74 نمبر11 جلد نمبر9

15_ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک صفحہ 654/6، ماہ ستمبر 1982ء

16_ اقتصادی مسائل الجہاد صفحہ 72

17_ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک صفحہ 681/33، ماہ ستمبر 1982ء

18_ حیات جاوید صفحہ 56 طبع سوم مولفہ مولانا الطاف حسین حالی۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔

19_ حیات جاوید صفحہ 56

20_ اشاعۃ السنۃ صفحہ (ہ) نمبر1 جلد 19

21_ ارواح ثلاثہ صفحہ 445 و صفحہ 446 حاشیہ و نظر ثانی مولانا اشرف علی تھانوی ناشر اسلامی اکادمی اردو بازار لاہور

❀❀❀
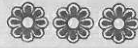
بریلوی علماء کا جہاد

مسلمانوں میں تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑا فرقہ بریلوی حضرات کا ہے جسے سواد اعظم کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ مولانا احمد رضا خاں بریلوی اس فرقے کے سربراہ تھے اور بلاشبہ اپنے دور کے جید عالم اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کی نعتیہ شاعری اور بہاردار فتوے ہمارے ادب کا بھی سرمایہ ہیں۔ ہندوستان میں ہزاروں خانقاہوں اور ان کے سجادہ نشیں حضرات کا تعلق بھی اسی مکتبہ فکر سے ہے۔ ان حضرات میں سے بیشتر کا علم و فضل اور مسلمان عوام پر غیر معمولی اثر و رسوخ مسلم ہے۔ علامہ فضل حق خیر آبادی اس جماعت کے سرخیل اول تھے۔ ان کے زمانے میں ان کے پائے کے عالم کم ہی تھے۔ ساری عمر سرکار انگریزی کی ملازمت میں گزاری۔ 1857ء میں جب بغاوت رونما ہوئی تو موصوف دلی تشریف لے آئے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب بغاوت عالم نزع میں تھی۔

علامہ فضل حق اور 1857ء کی بغاوت

علامہ فضل حق وسط اگست 1857ء میں دہلی تشریف لائے یعنی انگریزوں کی فتح سے تقریباً ایک ماہ قبل۔ اس ایک ماہ میں انہوں نے باغیوں کے ساتھ مل کر کیا کردار ادا کیا؟

کہا جاتا ہے کہ وہ باغیوں کے ساتھ مشوروں میں شریک رہے، جنرل بخت خاں نے انہی کے مشورے پر جہاد کا فتویٰ مرتب کروایا اور خود انہوں نے بھی اس فتوے پر دستخط کئے لیکن یہ خیال درست نہیں۔ جہاد کا فتویٰ جولائی 1857ء میں ان کی آمد سے

قبل ہی دہلی کے اخبارات میں شائع ہو گیا تھا۔ چنانچہ "صادق الاخبار" دہلی اور "سراج الاخبار" دہلی میں یہ فتویٰ چھپا ہوا موجود ہے۔ اس فتوے پر 34 علماء کے دستخط ہیں مگر ان میں علامہ فضل حق خیر آبادی کا نام کہیں درج نہیں۔ دوسری بات یہ کہ 1857ء کی بغاوت میں علامہ فضل حق خیر آبادی کے ایک ہم نام مولانا سید فضل حق شاہجہانپوری نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ سید صاحب نے بریلی کے باغی ناظم خان بہادر خاں اور بیگم حضرت محل (لکھنؤ) سے وابستہ رہ کر فوجی اور انتظامی خدمات سرانجام دیں۔ جب علامہ فضل حق خیر آبادی پر مقدمہ چلا اور اس کی روداد اخبارات میں شائع ہوئی تو نام کی مشارکت کی وجہ سے سید فضل حق شاہجہانپوری کے بہت سے جرائم علامہ فضل حق خیر آبادی سے منسوب ہو کر اخبارات میں مشتہر ہونے لگے چونکہ اس طرح علامہ فضل حق خیر آبادی کے مقدمے پر خراب اثر پڑ رہا تھا اور وہ مجرم ثابت ہو رہے تھے اس لئے انہوں نے نواب رام پور کو ایک عرضی لکھی جن کے دربار سے علامہ موصوف وابستہ رہ چکے تھے۔ یہ عرضی ریاست رام پور کی سرکاری لائبریری سے ملی ہے۔ عرضی فارسی میں ہے اور ماہنامہ "تحریک" دہلی (اگست 1957ء) کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے۔ علامہ فضل حق نواب صاحب کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں۔

"فدوی رابعلت نوکری خان بہادر خاں و نظامت پیلی بھیت و چکلہ داری محمدی و افسری لشکر باغی ماخوذ کردہ اند حالانکہ فدوی ازیں ہر سہ امر محض بری است و منشاء مواخذہ آنست کہ شخصے میر فضل حق نام از سادات شاہجہاں پور کہ قبل ازیں در سرکار ابد قرار بندگان عالی ملازم ماندہ سررشتہ داری پیلی بھیت ماخوذ شدہ و زمانے تحصیلدار آنولہ و پیلی بھیت ماندہ بود در ابتلائے غدر از طرف خاں علی خاں چکلہ داری محمدی شدہ پس از زمانے با افسری کدامی لشکر باغی ہمراہ فیروز شاہ آں طرف جمن فرار کرد عزیزان او در سرکار کمپنی بعہدہ ہائے جلیلہ مامور اند چنانچہ برادر حقیقی او مولوی مبین ڈپٹی کلکٹر سہارنپور بود، مہتممان اخبار خانہ خراب ناواقف ازیں تفصیل کہ او شخصے دیگر است و فدوی از شیوخ خیر آباد شخصے دیگر۔ در اخبار نامہا حال نظامت پیلی بھیت و محمدی و افسر لشکر۔ فرار او با فیروز شاہ طرف جمن نوشتہ بعض کہ برادر حقیقی او در سرکار مہاراجہ پٹیالہ نوکر و برادر

دیگرش در سہارنپور ڈپٹی کلکٹر است و حاکمان اینجا با شتباہ ہماں مولوی فضل حق کہ ہم
نام و در بعضے علامات شریک فدوی است فدوی را محض بے جرم مقید کردہ اند"۔(1)

اس عرضی کا خلاصہ یہ ہے کہ "فدوی (فضل حق خیر آبادی) کو خان بہادر خاں (بریلی کے باغی حاکم) کی ملازمت اختیار کرنے اور ان کی طرف سے پیلی بھیت کی نظامت، علاقہ محمدی کی چکلہ داری اور باغی لشکر کی افسری پر مامور ہونے کے جرم میں قید کر دیا گیا ہے حالانکہ فدوی ان تینوں جرائم سے بری ہے۔ ان جرائم کا مرتکب میر فضل حق نام کا ایک دوسرا شخص ہے جو شاہجہان پور کے سادات سے تعلق رکھتا ہے اور اس سے قبل حضور کی سرکار ابد قرار (یعنی نواب رام پور کی سرکار) سے وابستہ رہ چکا ہے۔ یہی فضل حق غدر کے زمانے میں خان بہادر خاں (حاکم بریلی) کی طرف سے پیلی بھیت اور محمدی میں چکلہ دار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتا رہا پھر باغی لشکر کے ساتھ دریائے جمنا کی طرف فرار ہو گیا۔ ان اخبارات کے مہتمموں کو جن کا خانہ خراب ہو اصل واقعات کا علم نہیں کہ وہ فضل حق اور شخص ہے جس نے بغاوت میں حصہ لیا اور فدوی فضل حق دوسرا شخص ہے۔ پس نام کی مشابہت اور بعض دیگر علامات کی وجہ سے فدوی کو جو بے گناہ ہے یہاں کے انگریزی حکام نے بغاوت میں بے خطا قید کر لیا ہے"۔

علامہ فضل حق خیر آبادی کی اس عرضی کا غیر جانبدارانہ اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کرنے سے مندرجہ ذیل نکات پیدا ہوتے ہیں۔

(1) علامہ مرحوم عرضی نواب رام پور کی سرکار میں ارسال فرماتے ہیں۔ یہ نواب انگریزوں کا بہت بڑا حامی و جاں نثار تھا۔ اس نے اپنی فوجوں سے انگریزوں کی مدد کی۔ چندوسی سے سنبھل تک ہر جگہ باغیوں کو کچل کر رکھ دیا۔ پھر مراد آباد میں باغی فوجوں کو شکست فاش دی اور انگریزوں کا اقتدار ان علاقوں میں از سر نو بحال کیا۔ اگر علامہ فضل حق دل سے سرکار انگریزی کی حکومت کے مخالف اور باغیوں کے حامی و بہی خواہ ہوتے تو ایسے نواب کی سفارش کا کبھی سہارا نہ لیتے جس کے دامن پر ہزاروں سرفروش باغیوں کا خون تھا اور جس نے ان کے منصوبوں کو خاک میں ملا کر انگریزی اقتدار از سر نو بحال کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان واقعات کے بعد بھی علامہ فضل

حق نے نواب رام پور کے ان افعال پر کسی قسم کی نفرت کا اظہار تو کجا اسے اپنا ہم نوا و سفارشی بنایا۔ اس کی حکومت کو "ابد قرار" کی دعا دی۔

(2) علامہ فضل حق نے خود کو ان تمام جرائم سے بری ظاہر کیا جو ان پر عائد کئے گئے تھے اور یہ جرائم ایک دوسرے فضل حق سے منسوب کئے۔ (جو بلاشبہ درست تھے) اگر علامہ واقعی دل سے باغیوں کے خیر خواہ ہوتے تو ایک ایسے شخص کی نشاندہی کر کے اسے مجرم ثابت نہ کرتے جس نے انگریزوں کی حکومت جڑ سے اکھیڑ پھینکنے میں بڑی جی داری کا ثبوت دیا۔

(3) علامہ فضل حق نے ان اخبارات کے مالکوں کو بھی بددعا دی اور انہیں خانہ خراب کے خطاب سے نوازا جنہوں نے انہیں بغاوت کے جرم میں ملوث کیا۔

(4) علامہ فضل حق نے اپنی عرضی میں 1857ء کے "جہاد" کو ابتلا اور غدر کے الفاظ سے موسوم کیا۔ گویا وہ اسے جہاد یا آزادی کی جنگ قرار نہ دیتے تھے بلکہ فتنہ اور شورش و فساد سمجھتے تھے۔

(5) آخر میں نواب رام پور سے فریاد کی کہ انہیں محض نام کی مشارکت کی وجہ سے دہلی کے انگریز حاکموں نے بے گناہ پکڑ لیا ہے۔

مولانا فضل حق کے خط کا مطالعہ ان حقائق کی تائید کرتا ہے۔ اس عرضی کے منظر عام پر آ جانے کے بعد علامہ فضل حق کی جنگ آزادی میں شرکت اور آزادی کے لئے جدوجہد محض افسانہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اگر انہیں سزا ہوئی تو بقول ان کے جرم بے گناہی میں ہوئی اور نام کی مشارکت کی وجہ سے انہیں وہی فضل حق سمجھ لیا گیا جو سادات شاہجہاں پور سے تعلق رکھتے تھے اور جنہوں نے 1857ء کی بغاوت میں مردانہ وار حصہ لیا تھا۔ یہ بیان خود علامہ فضل حق کا ہے نواب رام پور کے نام ان کی عرضی اس کی تائید کرتی ہے۔ 1857ء میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں بے گناہ افراد کو گولی مار کر یا پھانسی دے کر ختم کر دیا گیا اور ان کی جائیدادیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں انہی میں علامہ فضل حق بھی تھے جنہیں کالا پانی کی سزا ہوئی۔ چونکہ انہیں انگریز حکام نے بے گناہ سزا دی تھی اور ایک اور شخص کے جرم ان کے سر تھوپ دیئے تھے اس لئے اس کا رد عمل ہوا اور

انہوں نے جزائر انڈمان میں اپنی اسیری کے دوران انگریزی حکومت کو خوب جلی کٹی سنائیں یہ ایک قدرتی امر تھا۔ اس کے باوجود ان کے فرزند مولانا عبدالحق جنہیں سرکار برطانیہ سے شمس العلماء کا خطاب عطا ہوا تھا علامہ فضل حق کی رہائی کے لئے کوشش بھی کرتے رہے۔ اغلب ہے کہ وہ بے گناہی ثابت ہونے پر رہا ہو بھی جاتے مگر افسوس کہ موت نے مہلت نہ دی اور اپنے عہد کا یہ جید عالم' شاعر اور انشا پرداز مسلمانوں کی بربادی پر خون کے آنسو روتا ہوا 1861ء میں مالک حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ جزائر انڈمان کی خاک نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

خانقاہ نشیں اور 1857ء کی بغاوت

علماء کے بعد عوام پر سب سے زیادہ اثر صوفیا اور اہل خانقاہ کا ہوتا ہے بلکہ یہ حضرات علماء سے بھی زیادہ موثر ہوتے ہیں۔ 1857ء کی بغاوت میں ان حضرات نے کیا کردار ادا کیا؟ تفصیل کی گنجائش نہیں ایک دو واقعات بہ طور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

بریلی کو ہماری مذہبی تاریخ میں بڑا اہم مقام حاصل ہے۔ یہاں بڑے بڑے صوفیا اور علما پیدا ہوئے جن سے برصغیر کے لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان متاثر ہوئے۔ انہی بزرگوں میں حضرت شاہ نیاز احمد بریلوی تھے جو اپنے زمانے کے ممتاز روحانی پیشوا تھے۔ بے شمار افراد ان کے مرید تھے۔ 1857ء کی بغاوت کے وقت ان کے فرزند اور نامور شیخ طریقت شاہ نظام الدین خانقاہ نیازیہ کے سجادہ نشیں تھے۔ شاہ نظام الدین نے اس بغاوت میں حکومت انگلشیہ کی بھرپور حمایت کی۔ چنانچہ شاہ نظام الدین بریلوی کے ایک مرید مولوی محمد فائق نظامی نیازی لکھتے ہیں کہ:۔

"شاہزادہ جمہور سے (جو افغانستان کے ایک معزول حکمراں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے) انگریزوں نے مدد مانگی۔ (شہزادہ موصوف شاہ نظام الدین بریلوی کے مرید تھے اس لئے) انہوں نے کہا کہ اگر ہمارے پیر اجازت دیں تو ہم مدد کر سکتے ہیں۔ چنانچہ شہزادہ موصوف نے ایک خط حضرت کو لکھا "آپ کس جانب ہیں" اور وہ خط بذریعہ آدمی انگریزوں نے بریلی بھیجا۔ حضرت نے جواب دیا کہ "ہم جس طرف خدا ہے

اس طرف ہیں بظاہر تم کو انگریزوں کی مدد کرنا چاہئے"۔ پس شہزادہ جمہور نے اپنے بھائی بند شہزادہ ولی احمد اور شہزادہ سلطان جان مع ایک ہزار آدمیوں کے انگریزوں کو دیا اور دس ہزار روپے دیئے۔ انگریز نے ان سب کو نوکر رکھ کر بطور پلٹن مرتب کر کے دہلی لائے۔ چنانچہ فتح دہلی تا فرخ آباد بنام اس پلٹن کے لکھی گئی۔ بعد ازاں یہ پلٹن مستعفی ہو کر اپنے وطن کو واپس گئی۔ وقت مراجعت ناظر شمس الدین صاحب یہیں رہے۔ شہزادہ سلطان جان کو انگریزوں نے مقام کوٹہ کا ڈپٹی مقرر کیا۔ چنانچہ اب تک وہ ڈپٹی رہے۔ اب انتقال کیا ہے۔۔۔۔۔ جب یہ لوگ جانے لگے تو اپنے ہتھیار حضرت (شاہ نظام الدین سجادہ نشین خانقاہ نیازیہ) کو دے گئے کہ آپ کو جس قدر ہتھیاروں کی اجازت ملے آپ رکھیں باقی سرکار میں داخل کر دیجئے۔ چنانچہ حضرت نے ایک سو ستر ہتھیار مال خانے میں داخل کئے۔ صاحب مجسٹریٹ نے دریافت کیا کہ اس قدر ہتھیار آپ نے کیسے رکھے تو حضرت نے جواب دیا کہ آپ کی فوج کے ہیں۔ وقت واپسی مجھ کو دے گئے ہیں کہ جس قدر آپ رکھیں' رکھیں۔ باقی سرکار میں داخل کر دیجئے یہ وہ ہتھیار ہیں جو میرے نہیں۔ صاحب مجسٹریٹ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ سب پلٹن ان کی مرید ہے اور ان کے ہی حکم سے لڑی ہے تو خاموش رہے۔ اس مضمون کو آنریبل جان **انگلس** صاحب حاکم کونسل ہند خوب جانتے ہیں اور بریگیڈیئر کک صاحب بھی جانتے ہیں۔ جب یہاں (بریلی) بھاگڑ پڑی تو حضرت (شاہ نظام الدین) شاہ آباد ضلع رام پور تشریف لے گئے۔ بعد امن و اماں حکام نے حضرت کو بلوایا تو حضرت نے امن راہ کا عذر کیا تو بریلی سے واسطے حفاظت کے دو گارڈ جنگی بھیجے گئے تاکہ حضرت کو بحفاظت مکان پر پہنچائیں۔ حضرت کی دستی رسید جا کر صاحب کلکٹر بہادر کو دی گئی۔ پھر حکام نے معاوضہ خیر خواہی تجویز کیا۔۔۔۔ جب تک وہ حکام رہے حضرت کی بہت عزت کرتے رہے۔ چنانچہ جان **انگلس** صاحب جب تک ہندوستان میں رہے' برابر حضرت کو خط بھیجتے رہے"۔ (2)

صرف ایک حوالہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ بہت سے خانقاہ نشیں حضرات کی ہمدردیاں 1857ء میں انگریزوں کے ساتھ تھیں۔ شاہ نظام الدین بریلوی نے نہ صرف انگریزوں کی حمایت میں پٹھانوں کی پلٹن بھرتی کروائی بلکہ "خدا کو انگریزوں کی

طرف" قرار دیا۔ اس پلٹن نے دہلی سے فرخ آباد تک باغیوں کی سرکوبی میں حصہ لیا اور یہ فتوحات اسی پلٹن کے نام لکھی گئیں۔ انگریز حکام شاہ نظام الدین کی اس حمایت پر زندگی بھر ان کے ممنون رہے۔ اس خدمت کا شاہ صاحب موصوف کو انعام کی صورت میں صلہ بھی ملا۔ انگریز افسروں کی ان سے خط و کتابت رہی اور انہیں انگریزی فوج کے گارڈ کی حفاظت میں رام پور سے بریلی لایا گیا۔

پیرولایت شاہ کی حمایت سرکار

ہمارے تذکرہ نگاروں نے بعض رئیسوں کو خواہ مخواہ بدنام کیا اور یہ کہہ کر انگریزوں کا ایجنٹ ثابت کیا کہ انہوں نے سواروں کے دستے بھیج کر اور ہتھیار دے کر انگریزوں کی امداد کی۔ اس آئینے میں بہت سے مقدس چہرے نظر آتے ہیں۔ انہی میں ملتان کے وہ بزرگ بھی شامل ہیں جن کا نام نامی و اسم گرامی حضرت پیر مخدوم ولایت شاہ تھا۔ موصوف موسیٰ پاک شہیدؒ ملتانی کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ آپ ذاتی طور پر تین سو سواروں کا دستہ لے کر احمد خاں کھرل کے مقابلے پر تشریف لے گئے۔ جس نے ساہی وال میں انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ احمد خاں کے خلاف پیر صاحب نے (ان کے تذکرہ نگار کے بقول) نہ صرف جوہر شجاعت دکھائے بلکہ میدان جنگ میں ازروئے کشف پیش گوئی فرمائی کہ فتح گورنمنٹ انگریزی کی ہو گی۔ آپ نے ہدایت فرمائی کہ علاقے کے دوسرے سرداروں سے کہو اس بیہودہ مقابلے سے باز آجاؤ اور سرکار سے موافقت کر کے اپنے اقتدار کو تقویت دو اور اس میں اضافہ کرو۔ (3)

کیا ایسے بزرگوں اور پیروں کے بارے میں تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ یہ انگریزوں کے ایجنٹ تھے؟

ظاہر ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ کیا ازروئے شرع محمدی کیا۔ پھر جن رئیسوں نے 1857ء کے جہاد میں گھوڑے اور سوار دے کر انگریزوں کی امداد کی وہ انگریزوں کے ایجنٹ کیسے ہو گئے؟ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔

مولانا احمد رضا خان کا نظریہ جہاد

بریلوی مکتبۂ فکر کے عظیم رہنما اور بریلوی فرقے کے امام مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا نام نامی و اسم گرامی بھی ان علمائے کرام میں سرفہرست ہے۔ جنہوں نے ہندوستان میں امتناع جہاد کا فتویٰ دیا۔ مولانا نے اپنے فتوے کی بنیاد ٹھوس اور ناقابل شکست دلائل پر رکھی۔ انہوں نے اپنا ذاتی خیال پیش نہیں کیا بلکہ فقہ اسلامیہ کی مستند ترین کتب مثلاً فتاوے عالم گیر، الدرالمختار، شرح نقایہ، تنویر الابصار اور الطحاویہ کے حوالوں سے ثابت کیا کہ ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالسلام ہے اور دارالسلام میں جہاد ناجائز ہے۔ چنانچہ مولانا اپنی کتاب "اعلام الاعلام" میں لکھتے ہیں کہ "امام اعظم بلکہ دوسرے تینوں ائمہ کے مذہب کی رو سے ہندوستان دارالاسلام ہے دارالحرب ہرگز نہیں۔ کیونکہ جن تین باتوں کی وجہ سے کوئی ملک دارالاسلام کی بجائے دارالحرب ہو جاتا ہے ان میں سے ہمارے امام اعظم (حضرت امام ابو حنیفہؒ) کے نزدیک ایک یہ ہے کہ اس ملک میں احکام شرک مکمل طور پر جاری ہوں اور شریعت اسلامیہ کے احکام و شعائر مطلقاً جاری نہ ہونے پائیں مگر بحمد اللہ کہ یہ بات یہاں (ہندوستان میں۔ ناقل) مطلقاً موجود نہیں۔ اہل اسلام جمعہ و عیدین اور اقامت نماز باجماعت وغیرہ امور شریعت بلامزاحمت علی الاعلان ادا کرتے ہیں۔ نکاح، طلاق، مہر، خلع، وقف، وصیت وغیرہ مسلمانوں کے بہت معاملات ہماری شریعت کی بنا پر فیصل ہوتے ہیں اور ان امور کے بارے میں انگریز حکام کو بھی علماء سے فتویٰ لینا اور اس پر عمل و حکم کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بحمد اللہ کہ شریعت اسلامیہ کی شوکت و جبروت ایسی قائم ہے کہ مخالفین (حکومت انگریزی۔ ناقل) بھی اسے تسلیم کرنے اور اس کی اتباع کرنے پر مجبور ہیں---- (4)
الحاصل ہندوستان کے دارالاسلام ہونے میں شک نہیں"۔ (5) (ملخص)

ہندی مسلمانوں پر جہاد فرض نہیں

مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے نظریے کے مطابق جس کی بنیاد الدرالمختار اور الطحاویہ جیسی مستند کتب پر ہے اور "فتاویٰ بزازیہ" سے بھی اس کی تائید

ہوتی ہے ایک ملک تو وہ ہے جس پر کفار کا غلبہ و تسلط ہو۔ اس پر صرف انہی کے احکام نافذ ہوں۔ اسلامی احکام معطل و منسوخ ہوں اور مسلمان اپنی زندگی احکام اسلامی کے تحت نہ گزار سکتے ہوں۔ ایسا ملک بلاشبہ دارالحرب ہے اور وہاں جہاد جائز ہے بشرطیکہ مسلمانوں کو اس کی قوت بھی حاصل ہو۔

(2) دوسرا ملک وہ ہے جس پر مسلمانوں کی حکومت ہو اور حاکم شرع اسلامیہ کے تحت فیصلے کرتا ہو۔

(3) تیسرا ملک وہ ہے جس پر مسلمانوں کی حکومت ہو مگر فیصلے شرعی قوانین کے ساتھ ساتھ ایسے قوانین کے تحت بھی ہوتے ہوں جن کی تصریح شرع میں نہیں۔

(4) چوتھا ملک وہ ہے جس پر غلبہ و اقتدار تو غیر مسلم بادشاہ یا حاکم کا ہو مگر احکام غیر اسلامی بھی نافذ ہوں اور اسلامی قوانین کے تحت بھی فیصلے ہوتے ہوں اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو شریعت محمدیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو۔ یہ تینوں قسم کے ممالک دارالحرب نہیں کہلائیں گے بلکہ دارالاسلام سمجھے جائیں گے۔ امام حلوانیؒ کا صاف فیصلہ ہے کہ جو ملک کسی غیر مسلم حکومت کے تابع ہو مگر وہاں مسلمانوں کے مذہبی امور ان کے شرع کے مطابق سرانجام پاتے ہوں، مسلمان امن میں ہوں تو وہ ملک دارالحرب نہیں رہے گا بلکہ دارالاسلام ہو جائے گا اور دارالاسلام میں جہاد جائز نہیں۔

یہ ہیں احکام اور فقیہان اسلام کے فتاویٰ جن کی بنیاد پر مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی نے فتویٰ دیا کہ:۔

"مفلس پر اعانت مال (فرض) نہیں۔ بے دست و پا پر اعانت اعمال (فرض) نہیں لہٰذا مسلمانان ہند پر حکم جہاد و قتال نہیں"۔ (6)

پیران عظام کا گورنر اڈوائر کو سپاسنامہ

اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں بریلوی اپنے مریدین باصفا اور بریلوی مکتبہ فکر کے اکابر و عوام کو جو فکر و نظر عطا کر گئے اور جس راستے کی طرف رہنمائی کر گئے ان کے مریدین و متبعین نے اس سے سرمو انحراف نہ کیا۔ پیران طریقت نے ان کی نصیحت

کو گرہ میں باندھ لیا کہ امام اہل سنت کی نصیحت تھی اور اس کی بنیاد فقہ اسلامیہ کی مستند کتب پر تھی جس کی رو سے ایک پرامن حکومت کے خلاف خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو فتنہ و فساد حرام ہے۔ چنانچہ 1914ء کی جنگ عظیم اول ہو یا ترک موالات، مسئلہ خلافت ہو یا جلیانوالہ باغ کا سانحہ، اہل طریقت نے ہر موقعہ پر حکومت سے تعاون کیا، فتنہ و فساد سے اجتناب کیا اور سرکار برطانیہ سے وفاداری کا اظہار کیا۔ چنانچہ پنجاب کا گورنر سرمائیکل اڈوائر جب اپنے عہدے سے سبکدوش ہو کر وطن واپس جانے لگا تو پنجاب کے ان پیران طریقت نے گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں حاضر ہو کر اس کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا۔ یہ ایک تاریخی دستاویز ہے جو آئندہ نسلوں کے لئے بھی رہنمائی کا کام دے گی اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اہم حصے درج کر دیئے جائیں تاکہ یہ دستاویز زمانہ مستقبل کے لئے محفوظ ہو جائے۔

سپاسنامہ

بحضور نواب ہز آنر سرمائیکل فرانسس اڈوائر۔ جی۔ سی۔ آئی۔ ای۔ کے۔ سی۔ آئی۔ ایس گورنر پنجاب۔

حضور والا! ہم خادم الفقر سجادہ نشینان و علماء مع متعلقین شرکاء حاضرالوقت مغربی حصہ پنجاب نہایت ادب عجز و انکسار سے یہ ایڈریس لے کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں اور ہمیں یقین کامل ہے کہ وہ حضور انور جن کی ذات عالی صفات میں قدرت نے دل جوئی، ذرہ نوازی اور انصاف پسندی کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ ہم خاکساران باصفا کے اظہار دل کو توجہ سے سماعت فرما کر ہمارے کلاہ افتخار کو چار چاند لگا دیں گے۔

حضور انور! جس وقت ہم اپنی آزادیوں کی طرف خیال کرتے ہیں جو ہمیں سلطنت برطانیہ کے طفیل حاصل ہوئی ہیں اور پھر جب ہم بے نظیر برطانوی انصاف کو دیکھتے ہیں جس کی حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پی رہے ہیں تو پھر ہر طرف احسان ہی احسان دکھائی دے رہا ہے ع

بہشت آں جا کہ آزارے بناشد کسے رابا کسے کارے بناشد

ہم سچ عرض کرتے ہیں کہ جو برکات ہمیں اس سلطنت کی بدولت حاصل ہوئیں اگر ہمیں عمر خضر بھی نصیب ہو تو ہم ان احسانات کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔ ہندوستان کے لئے سلطنت برطانیہ ابر رحمت کی طرح نازل ہوئی اور ہمارے ایک بزرگ نے جس نے پہلے زمانہ کی خانہ جنگیاں اور بدامنیاں اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں اس سلطنت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے۔

ہوئیں بد نظمیاں سب دور انگریزی عمل آیا
بجا آیا' بہ استحقاق آیا' بر محل آیا

ہم حضور سے درخواست کرتے ہیں کہ جب حضور وطن واپس تشریف لے جائیں تو اس نامور تاجدار ہندوستان کو یقین دلائیں کہ چاہے کیسا ہی انقلاب کیوں نہ ہو' ہماری وفاداری میں سرموفرق نہ آیا ہے اور نہ آسکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ ہم اور ہمارے پیروان اور مریدان فوجی وغیرہ جن پر سرکار برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں ہمیشہ سرکار کے حلقہ بگوش اور جاں نثار رہیں گے۔

ہمیں نہایت رنج و افسوس ہے کہ ناتجربہ کار نوجوان امیر امان اللہ خاں والئی کابل نے کسی غلط مشورے سے عہد ناموں کے اور اپنے باپ دادا کے طرز عمل کی خلاف ورزی کر کے خدا تعالٰی کے صریح حکم "واوفوا بالعھد ان العھد کان مسئولاہ" یعنی "وعدے ایفا کرو۔ ضرور وعدے کے متعلق پوچھا جائے گا"_ کی نافرمانی کی۔ ہم جناب والا کو یقین دلاتے ہیں کہ امیر امان اللہ کے اس طرز عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ہم اہالیان پنجاب احمد شاہ (ابدالی_ ناقل) کے حملوں اور نادر شاہی غارت گری کو نہیں بھول سکتے۔ ہم اس غلط اعلان کی جس میں اس (امیر امان اللہ خاں۔ ناقل) نے سراسر خلاف واقعہ لکھا ہے اس سلطنت (حکومت برطانیہ۔ ناقل) کی مذہبی آزادی میں خدانخواستہ رکاوٹ واقع ہوئی تردید کرتے ہیں۔ امیر امان اللہ خاں کا خاندان سرکار **انگلشیہ** کی بدولت بنا اور اس کی احسان فراموشی کفران نعمت سے کم نہیں۔

ہم کو ان کوتاہ اندیش دشمنان ملک (جلیانوالہ باغ کے مظاہرین کی طرف اشارہ

ہے۔ ناقل) پر بھی سخت افسوس ہے جن کی سازش سے تمام ملک میں بدامنی پھیلی ہے اور جنہوں نے اپنی حرکات ناشائستہ سے پنجاب کے نیک نام پر دھبہ لگایا ہے۔ مقابلہ آخر مقابلہ ہی ہے اور کبھی خموش نہیں رہ سکتا۔ یہ حضور والا ہی کا زبردست ہاتھ تھا جس نے بے چینی اور بدامنی کا اپنے حسن تدبر سے فی الفور قلع قمع کر دیا۔ ان بدبختوں سے ازراہ بدبختی فاش غلطیاں سرزد ہوئیں لیکن حضور ابر رحمت ہیں اور ابر رحمت زرخیز اور شور زمین دونوں پر یکساں برستا ہے۔ ہم حضور کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان گمراہ لوگوں کی مجنونانہ جاہلانہ حرکات کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کیونکہ ہمارے قرآن کریم میں یہی تلقین کی گئی ہے "**لا تفسدوا فی الارض**" یعنی "دنیا میں فساد اور بدامنی مت پیدا کرو" اور "**ان اللہ لا یحب المفسدین**" یعنی "بے شک خدا فساد کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔"

حضور انور! اگرچہ آپ کی مفارقت کا ہمیں کمال رنج ہے۔

سر غم سے کھنچے کیوں نہ سردار ہمارا
لو ہم سے چھٹا جاتا ہے سردار ہمارا

لیکن ساتھ ہی ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضور کے جانشین سر ایڈورڈ میکلیگن بالقابہم جن کے نام نامی سے پنجاب کا بچہ بچہ واقف ہے جن کا حسن اخلاق رعایا نوازی میں شہرہ آفاق ہے جو ہمارے لئے حضور کے پورے نعم البدل ہیں ہم ان کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں اور ان کی خدمت میں یقین دلاتے ہیں کہ ہم مثل سابق اپنی عقیدت و وفاداری کا ثبوت دیتے رہیں گے۔

حضور اب وطن کو تشریف لے جانے والے ہیں۔ ہم دعا گویاں جناب باری میں دعا کرتے ہیں کہ حضور مع لیڈی صاحبہ و جمیع متعلقین مع الخیر اپنے پیارے وطن پہنچیں تا دیر سلامت رہیں اور وہاں جا کر ہم کو دل سے نہ اتاریں ع

ایں دعا از ماؤ از جملہ جہاں آمین باد

المستدعیان مخدوم حسن بخش قریشی' مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین خانقاہ' مخدوم شیخ محمد نواب حسن' مخدوم سید حسن علی' سید ریاض الدین شاہ' پیر غلام

عباس شاہ' دیوان سید محمد پاک پٹن' مخدوم صدر الدین شاہ آف ملتان' میاں نور احمد سجادہ نشین' پیر محمد رشید' شیخ شہاب الدین' سید محمد حسین شاہ شیر گڑھ ضلع منٹگمری' مخدوم شیخ محمد راجو آف ملتان' دیوان محمد غوث' محمد مہر علی شاہ جلال پور' پیر محمد خضر حیات شاہ' صاحبزادہ محمد سعد اللہ آف سیال شریف' سید غلام محی الدین آف گولڑہ شریف' سید قطب علی شاہ آف ملتان' پیر چراغ علی آف ملتان' پیر ناصر الدین شاہ آف شاہ پور' پیر غلام احمد شاہ آف شاہ پور' مخدوم غلام قاسم سجادہ نشین' سید نوازش حسین شاہ آف شیر گڑھ ضلع منٹگمری' مولوی غلام محمد خادم گولڑہ شریف' سید فدا حسین ضلع کیمبل پور' محمد اکبر شاہ آف شیر شاہ ملتان' غلام قاسم شاہ آف شیر شاہ ملتان' مولوی سید زین العابدین شاہ آف ملتان' پیر چراغ شاہ کوٹ سدھانہ جھنگ' محبوب عالم خادم گولڑہ شریف' منشی حیات محمد گولڑہ شریف' برہان الدین خادم گولڑہ شریف"۔ (7)

ان دستخط کنندگان میں دو خان بہادر یعنی خان بہادر مخدوم حسن آف ملتان اور خان بہادر شیخ احمد کے نام بھی شامل ہیں۔ کچھ اور پیران طریقت بھی ہیں جن کے نام خط شکست میں درج ہونے کی وجہ سے پڑھے نہیں جا سکے۔

غازی امان اللہ خاں کی مذمت؟

پاک پٹن شریف' گولڑہ شریف اور سیال شریف کے علاوہ صوبہ کی مختلف خانقاہوں کے سجادہ نشین حضرات نے اپنے اس سپاسنامے میں انگریزی حکومت کو باران رحمت قرار دیا' گورنر اڈوائر کو جس کے دامن پر جلیانوالہ باغ کے سینکڑوں مقتولوں کا خون ہے اپنا سردار قرار دیا' اسے "حضور انور" کے لقب سے نوازا۔ جلیانوالہ باغ کے سانحے میں حصہ لینے والے افراد اور ان کے لیڈروں کو دشمنان ملک' بدبخت' جاہل' مجنون اور مفسد قرار دیا۔ غازی امان اللہ شاہ افغانستان کو ناتجربہ کار' عہد شکن' احسان فراموش اور قابل نفرت بتایا اور انکشاف کیا کہ اس کا سارا خاندان انگریزوں کا خود کاشتہ شجر حکومت ہے۔ ترکوں کی جدوجہد اور انگریزوں سے ان کی جنگ کو کوتاہ اندیشی قرار دیا۔ ان کی جدوجہد کے بارے میں لکھا ہے کہ "یہ مسلمہ امر ہے کہ یہ جنگ مذہبی

اغراض پر مبنی نہ تھی"۔ ترکوں کے اس طرز عمل کے نتائج کا خود انہیں ذمہ دار قرار دیا۔ گورنر اڈوائر بہادر کے ذریعے "نامور تاجدار" برطانیہ کو یہ پیغام بھیجا کہ خواہ کچھ بھی ہو' حالات کیسا ہی رخ اختیار کریں ہم سجادہ نشیں اور علماء بدستور سرکار کے حلقہ بگوش (غلام۔ ناقل) رہیں گے۔ ہمارے وہ مرید جو فوج انگریزی میں شامل ہیں اور جن پر سرکار برطانیہ کے بے شمار احسانات ہیں وہ بھی بدستور حضور پر سے اپنی جانیں قربان کرتے رہیں گے۔

سوال یہ ہے کہ اتنے بڑے پیروں' صوفیوں اور عالمان دین نے جو لاکھوں مریدوں کے آقا اور مرشد تھے جنہیں کسی دنیاوی فائدے کی ضرورت نہ تھی سرکار برطانیہ کی اتنی تعریف کیوں کی؟ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ خوشامد کے تمام سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے۔ غریب سرسید کے گوشہ خیال میں بھی وہ الفاظ نہ آئے ہوں گے جو ان پیران عظام نے بادشاہ نصاریٰ اور ایک ظالم گورنر کی شان میں استعمال کئے۔ مگر حقیقت یہ نہیں جو ان پیران باصفا کے بعض ناقد بیان کرتے ہیں اور ان کے خلاف زبان طعن دراز کرتے ہیں۔ یہ گوشہ نشیں لوگ دنیا اور اس کے جھمیلوں سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ انہیں سرکار برطانیہ سے کچھ لینا نہیں تھا کہ وہ اس سے مستغنی تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ انہوں نے جو کچھ کہا اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کیا۔ جس طرح علمائے دیوبند مولانا مولوی مفتی محمد لدھیانوی' مولانا مفتی عبدالعزیز' مولانا مفتی عبداللہ اور مولانا محمد فضل عظیم خطیب دیوبند نے "نصرت الابرار" میں' مولانا سید نذیر حسین دہلوی نے فتاویٰ نذیریہ اور "کتاب الامارۃ والجہاد" میں' مولانا ابوسعید محمد حسین بٹالوی نے "اقتصاد فی مسائل الجہاد" میں' مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے سوانح عمری مولانا رشید احمد گنگوہی (تذکرۃ الرشید) میں' مولانا علامہ سید علی الحائری نے "موعظہ تقیہ" میں' شیعہ علمائے لکھنؤ (علامہ سید محمد صاحب اور آپ کے ساتھی علماء و مجتہدین) نے 1857ء کی بغاوت کے دوران "اعلام الاعلام" اور "دوام العیش فی الائمتہ من قریش" میں فاضل بریلوی مولانا احمد رضا خاں صاحب نے' ملکہ وکٹوریہ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر جماعت اہل حدیث نے اپنے نیازمندانہ و عقیدتمندانہ ایڈریس میں جن بنیادوں پر

انگریزوں کی حمایت کی، 1857ء کی بغاوت کو غدر اور فساد قرار دیا، سلطنت برطانیہ میں مذہبی آزادی کو رحمت خداوندی بتایا، انگریزوں کی اطاعت کرنے کو دین کا جزو قرار دیا اور انگریزوں کے خلاف جہاد کو ازروئے شرع محمدی حرام ثابت کیا۔ بالکل انہی بنیادوں پر پنجاب کے ان پیران طریقت اور علمائے کرام نے اپنے ایڈریس میں بادشاہ معظم، سلطنت برطانیہ اور گورنر اڈوائر کی خدمت میں اپنی وفاداری و نیازمندی کا اظہار کیا۔ اس سے ان کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں تھا بقول مولانا سید محبوب علی "مسئلہ ہی اس طرح تھا"۔

یہی "جرم" غریب سرسید احمد خاں سے سرزد ہو گیا۔ ان پیران عظام کے عہد کے مقابلے میں سرسید احمد خاں کا عہد تو بڑا خوفناک اور مسلمانوں کے لئے قیامت خیز تھا۔ اس زمانے میں تو بعض علاقوں میں مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ہونے کے لئے کافی تھا۔ پس سرسید احمد خاں نے انگریزوں کی حمایت میں جو کچھ کیا مسلمان قوم کو تباہی سے بچانے کے لئے کیا۔ ان کے بعض معاصرین نے اس امن و اماں کو نعمت سمجھا جو سکھوں اور مرہٹوں کی بربریت اور مسلم کشی کے دور کے بعد مسلمانوں کو نصیب ہوا تھا۔ وہ انگریزوں کے خلاف بغاوت کر کے مسلمانوں کو پھر اس عذاب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اگر یہ ان کا جرم تھا تو یاد رکھیئے کہ دیوبندی، اہل حدیث، بریلوی اور شیعہ فرقوں میں سے کسی کا دامن اس جرم سے پاک نہیں۔

مولانا مودودی کا نظریہ جہاد

1857ء کی بغاوت، ہندوستان کے دار الحرب یا دار الاسلام ہونے اور انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد کے بارے میں اب تک جو لٹریچر تخلیق ہوا اس میں سب سے بہتر، متوازن اور حقیقت افروز رائے جماعت اسلامی کے بانی سید ابو الاعلیٰ مودودی کی ہے۔ مرحوم علوم اسلامیہ اور تاریخ پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ اگرچہ ان کے بعض نظریات سے اتفاق ممکن نہیں مگر اس مسئلے پر انہوں نے جو چند سطریں لکھ دی ہیں اپنے طرز استدلال اور متوازن انداز فکر کے لحاظ سے وہ بڑی بڑی محققانہ اور عالمانہ کتابوں پر

بھاری ہیں۔ صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ:۔

"ہندوستان اس وقت بلاشبہ دار الحرب تھا جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کا فرض تھا کہ یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جان لڑاتے یا اس میں ناکام ہو جانے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے لیکن جب وہ مغلوب ہو گئے۔ انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لا پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول کر لیا تو اب یہ ملک دار الحرب نہیں رہا اس لئے کہ یہاں تمام اسلامی قوانین منسوخ نہیں کئے گئے ہیں، نہ مسلمانوں کو سب احکام شریعت کے اتباع سے روکا جاتا ہے"۔ (8)

ظاہر ہے کہ اگر مولانا مودودی 1857ء میں موجود ہوتے تو ان کا فتویٰ اس وقت بھی یہی ہوتا اور بلاشبہ وہ انگریزوں کی حمایت اور باغیوں کی مخالفت کرتے کیونکہ مولانا نے اپنے فتوے کی بنیاد ان تین امور پر رکھی ہے۔

(1) جس وقت اسلامی ملک پر کوئی غیر مسلم بادشاہ حملہ آور ہو تو وہ اسلامی ملک دار الحرب ہو جاتا ہے اور مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ ان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ اپنی تمام قوتیں یکجا کر کے کافروں سے جنگ کریں۔

(2) مغلوب ہو جانے کی صورت میں اگر ممکن ہو تو کسی اسلامی ملک میں ہجرت کر جائیں۔

(3) جب کافروں کی نئی حکومت قائم ہو جائے، وہ مسلمانوں کو امن دے اور ان کے دینی امور میں مداخلت نہ کرے بلکہ انہیں ان کے شرعی قوانین کے مطابق زندگی گزارنے کی آزادی دے تو گویا غیر مسلم حاکم اور مغلوب مسلمانوں میں ایک معاہدہ ہو جاتا ہے اس معاہدے کی موجودگی میں ان کے لئے جہاد کرنا جائز نہیں رہتا۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا نظریہ جہاد

بالکل یہی نقطہ نظر اہل دیوبند کے سرخیل اور ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی نے اختیار کیا۔ مولانا موصوف نے کسی ملک کے دار الاسلام سے دار الحرب میں

تبدیل ہو جانے کو بعض شرائط سے مشروط کیا ہے اور پھر ثابت کیا ہے کہ ہندوستان دارالحرب نہیں بلکہ دارالامن ہے جہاں جہاد جائز نہیں چنانچہ آپ اپنی ایک محققانہ تالیف میں مستند کتابوں سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"اب باقی رہی تحقیق اس کی کہ ہندوستان دارالاسلام ہے یا دارالحرب' پس ظاہر ہے کہ قبل عملداری انگریز ہندوستان دارالاسلام تھا اور ہندو وغیرہ ذمی ہو کر رہتے تھے۔ اب یہ جاننا چاہئے کہ دارالاسلام کن چیزوں سے دارالحرب ہو جاتا ہے۔ اس میں امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کا مذہب تو یہ ہے کہ مجموعہ امور ثلاثہ سے ہوتا ہے (1) شرک کے احکام جاری ہونے سے۔ تفسیر اس کی یہ ہے کہ احکام اسلام میں سے کچھ باقی نہ رہے (2) دارالحرب کے متصل ہونے سے (3) اس سے کہ وہاں مسلم یا ذمی بے دھڑک باقی نہ رہے"۔

یہ شرائط بیان کرنے کے بعد مولانا تھانوی ان شرائط کو ہندوستان کے حالات پر چسپاں کر کے ثابت کرتے ہیں کہ یہ ملک دارالامن ہے۔ فرماتے ہیں۔ "ہندوستان نہ تو صاحبین کے قول پر دارالحرب ہے کیونکہ احکام شرک کے علی الاعلان جاری ہیں لیکن احکام اسلام کے بھی بلاخوف مشتہر ہیں اور دونوں کے باقی رہنے سے دارالحرب نہیں ہوتا اور نہ امام صاحب کے قول پر دارالحرب ہے اجرائے احکام بہ تفسیر یہاں نہیں ہوا بلکہ بدستور احکام اسلام جاری ہیں اور ایسی صورت میں دارالحرب نہیں ہوتا"۔ (9) آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"تیسری شرط بھی مفقود ہے کیونکہ ابتدائے حکومت انگریزی میں رعایا پر کسی قسم کی دارو گیرو بے اطمینانی سرکار کی جانب سے نہیں ہوئی بلکہ بدستور ہر شخص اپنے جان و مال پر مطمئن رہا۔ شاید کسی کو شبہ ہو کہ غدر سے تو امان اول باقی نہیں رہا بلکہ عہد ثانی کی ضرورت ہوئی۔ اول تو یہ بات غلط ہے۔ غدر میں صرف باغیوں کو اندیشہ تھا عام رعایا سرکار مطمئن تھی"۔ (10)

مولانا تھانوی کا فتویٰ اتنا واضح ہے کہ اس پر کسی قسم کے تبصرے کی ضرورت نہیں نہ یہ کسی تشریح و توضیح کا محتاج ہے۔ البتہ اس میں ایک ایسا نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ جس

کی طرف دوسرے علماو مفتیان کرام کی نگاہ نہیں گئی۔ مولانا نے ہندوستان کو دارالامن قرار دینے کے ساتھ ساتھ 1857ء کی بغاوت کے لئے ہر قسم کا جواز ختم کر دیا۔ نہ صرف 1857ء میں باغیوں کے اس اقدام کو غلط ثابت کیا بلکہ انگریزوں کے عہد حکومت کو از ابتدا تا انتہا پر امن دور قرار دیا اس سلسلے میں مولانا نے تین نکتے بیان فرمائے۔

(1) جب انگریزوں نے ابتدا میں اس ملک کے کسی حصے پر قبضہ کیا تو عام رعایا پر ظلم و ستم نہیں کیا گیا بلکہ ہر شخص اپنے معمول کے مطابق پر امن زندگی گزارتا رہا سکھوں اور مرہٹوں کی طرح عام لوگوں کو جان و مال کی غارت گری سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔

(2) اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ غدر 1857ء کے بعد وہ امن ختم ہو گیا جو انگریزوں نے یہاں کے لوگوں کو عطا کیا تھا اور دوسرے عہد نامے اور امان نامے کی ضرورت تھی تو یہ غلط ہے۔ کسی نئے عہد نامے یا امان نامے کی ضرورت نہیں تھی پہلا امان نامہ یا معاہدہ کافی تھا۔

(3) اس کی وجہ مولانا یہ بیان فرماتے ہیں کہ غدر تو باغیوں نے کیا تھا عام رعایا نے نہیں کیا تھا وہ سرکار سے مطمئن تھی اگر اندیشہ تھا تو باغیوں کو۔ اگر عہد ثانی اور امان نامے کی ضرورت تھی تو باغیوں کو' عوام کو اس کی مطلق ضرورت نہ تھی۔

مولانا تھانوی کی ان تصریحات کی روشنی میں نہ 1857ء میں باغیوں کا اقدام درست تھا' نہ یہ جنگ و جدل جہاد تھا۔ نہ دارالامن اور دارالاسلام ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں جہاد کی گنجائش تھی کیونکہ مولانا موصوف کے بقول ابتدائے حکومت سے انگریز عدل و انصاف کے تقاضے پورے کر رہے تھے۔ ہر طرف امن کی شہنائی بج رہی تھی احکام شریعت پر عمل ہو رہا تھا۔ گویا مولانا احمد رضا خاں بریلوی' مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا اشرف علی تھانوی تینوں چوٹی کے علماء اور مفکر اس امر پر متفق ہیں کہ ہندوستان دارالامن اور دارالاسلام تھا یہاں جہاد کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید احمد خاں جو فکر اور سوچ عطا کر گئے تھے وہی درست تھی اور بعد کے مسلمان علماو مفکرین نے اس پر صاد کر دیا۔

بغاوت کے حامی علماء

اب ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے کہ آخر 1857ء میں ایسے علماء بھی تو تھے جنہوں نے اس جنگ کو جہاد قرار دیا' اس کی حمایت کی' اس میں پرجوش اور مردانہ وار حصہ لیا، ہوش ربا تکلیفیں اٹھائیں حتیٰ کہ اپنی جان عزیز بھی اس راہ میں قربان کردی انہیں کیامقام دیا جائے گا۔ 1857ء کے بعد بھی انگریزوں کی مخالفت کا سلسلہ جاری رہا اور بعض علماء نے انگریزوں کے خلاف سخت جدوجہد کی۔ اس کاجواب کچھ مشکل نہیں۔ اصل بات یوں ہے کہ یہ نقطہ نظر کا اختلاف تھا جو علماء دیانتداری سے یہ سمجھتے تھے کہ 1857ء کی بغاوت واقعی جہاد ہے اور وہ اپنی نیت میں مخلص تھے ان پر کسی قسم کی حرف گیری نہیں کی جاسکتی۔ ان کے علم و فکر نے انہیں اسی نتیجے تک پہنچایا اور انہوں نے اس کے مطابق قدم اٹھایا۔ جو علماء ازروئے شرع 1857ء کی بغاوت کو جہاد نہیں سمجھتے تھے بلکہ مسلمانوں کی بربادی کا پیش خیمہ جانتے تھے جس کے لئے ان کے پاس دلائل شرعیہ موجود تھے وہ اپنی جگہ مخلص اور نیک نیت تھے۔ انہوں نے جو کچھ کیا مسلمانوں کی بھلائی کے لئے کیا اور واقعات نے ثابت کردیا کہ ان کی رائے اور اقدام درست تھا۔ سرسید احمد خاں انہی علماء کے ہم خیال تھے۔

حواشی:

1_ ماہنامہ "تحریک" دہلی اگست 1957ء بحوالہ "جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات" صفحہ 568

2_ کرامات نظامیہ صفحہ 269 و صفحہ 270 مولفہ مولوی محمد فائق نظامی نیازی بحوالہ جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات صفحہ 290 و صفحہ 291

3_ تذکرہ مشائخ قادریہ (قلمی) مولفہ قاضی برخوردار ملتانی بحوالہ "جنگ آزادی 1857ء واقعات و شخصیات" صفحہ 586

4_ اعلام الاعلام بان ہندوستان دارالاسلام صفحہ 2 مولفہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی زیر اہتمام مولوی محمد حسنین رضاخاں مطبوعہ حسنی پریس واقع آستانہ عالیہ رضویہ محلہ سوداگراں بریلی

5_ اعلام الاعلام صفحہ 7

6_ دوام العیش فی الائمۃ من قریش صفحہ 46 اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مولانا شاہ احمد رضاخاں بریلوی۔ شائع کردہ مکتبہ رضویہ لاہور۔

7_ بریلوی فتوے صفحہ 165 تا صفحہ 172 مولفہ مبلغ اسلام مولانا نور محمد شائع کردہ انجمن ارشادالمسلمین 6_بی' شاداب کالونی۔ حمید نظامی روڈ لاہور۔

8_ "سود" صفحہ 77 کا حاشیہ۔ مولفہ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ شائع کردہ مکتبہ جماعت اسلامی ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

9_ تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان صفحہ 8 مولفہ مولانا اشرف علی تھانوی مطبوعہ اشرف المطابع تھانہ بھون۔

10_ تحذیر الاخوان عن الربوٰ فی الھندوستان صفحہ 9

سید احمد شہیدؒ کا جہاد

1857ء کی بغاوت سے قریباً اکتیس سال قبل یعنی 1826ء میں سید احمد شہیدؒ نے جہاد کا آغاز کیا۔ آغاز جہاد سے قریباً دو برس قبل آپ نے تحریک جہاد شروع کی، ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کئے، اپنے داعیوں کو مختلف مقامات پر بھیج کر مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار و آمادہ کیا، اپنے مریدوں کو خاص طور پر ہدایت فرمائی کہ وہ بندوق چلانے اور نشانہ بازی کی مشق کریں۔ جنوری 1826ء میں سید صاحب سفر جہاد پر روانہ ہوئے مگر رخ دہلی یا کلکتہ کی طرف نہیں کیا بلکہ پنجاب کی طرف رخت سفر باندھا۔ سید صاحب کے ایک عقیدتمند اور فاضل اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:۔

"یہ بھی ایک صحیح روایت ہے کہ جب آپؒ (سید صاحب) سکھوں سے جہاد کرنے کو تشریف لے جاتے تھے (تو) کسی شخص نے آپ سے پوچھا کہ آپ اتنی دور سکھوں پر جہاد کرنے کو کیوں جاتے ہو انگریز جو اس ملک پر حاکم ہیں اور دین اسلام سے کیا منکر نہیں ہیں گھر کے گھر میں ان سے جہاد کر کے ملک ہندوستان لے لو۔ یہاں لاکھوں آدمی آپ کا شریک اور مددگار ہو جائے گا کیونکہ سینکڑوں کوس سفر کر کے سکھوں کے ملک سے پار ہو کر افغانستان میں جانا اور وہاں برسوں رہ کر سکھوں سے لڑنا یہ ایک امر محال ہے جس کو ہم نہیں کر سکتے۔ سید صاحب نے جواب دیا کہ کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا نہ سکھوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے بلکہ سکھوں سے جہاد کرنے کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ ہمارے برادران اسلام پر ظلم کرتے اور اذان وغیرہ فرائض مذہبی ادا کرنے کے مزاحم ہوتے ہیں۔ اگر سکھ اب یا ہمارے غلبہ کے بعد ان حرکات مستوجب جہاد سے باز آجائیں گے تو ہم کو ان سے لڑنے کی ضرورت نہ رہے

گی اور سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم اور تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ ہم ان کے ملک میں اعلانیہ وعظ کہتے اور ترویج مذہب کرتے ہیں وہ کبھی مانع اور مزاحم نہیں ہوتی بلکہ اگر ہم پر کوئی زیادتی کرتا ہے تو اس کو سزا دینے کو تیار ہے۔ ہمارا اصل کام اشاعت توحید الٰہی اور احیاء سنن سید المرسلینؐ ہے سو ہم بلا روک ٹوک اس ملک میں کرتے ہیں پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گراویں"۔(1)

سید صاحب کا نظریہ جہاد

سید احمد شہید کے اس جواب سے ان کا نظریہ جہاد واضح ہو جاتا ہے یعنی

(1) جہاد کا مقصد خواہ مخواہ کسی کا ملک چھین کر اس پر قبضہ کر لینا ہرگز نہیں۔

(2) وہ ملک سکھوں کا ہو یا انگریزوں کا۔

(3) جہاد اس حکومت کے خلاف کیا جاتا ہے جو مسلمانوں پر ظلم کرے، ان کے دینی امور میں مداخلت کرے اور انہیں ان کے مذہبی فرائض ادا کرنے سے روکے۔

(4) اگر سکھ مسلمانوں پر ظلم کرنے سے باز آجائیں اور انہیں فرائض مذہبی ادا کرنے سے نہ روکیں تو ان کے خلاف بھی جہاد نہیں ہو سکتا۔

(5) سرکار انگریزی اگرچہ اسلام کی منکر ہے مگر مسلمانوں پر ظلم و ستم نہیں کرتی انہیں عبادت لازمی سے نہیں روکتی اور اپنی حدود سلطنت میں امور شریعت کی تلقین و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں لگائی اس لئے اس کے خلاف جہاد ناجائز ہے۔

(6) جہاد بلاوجہ یا محض حصول اقتدار کے لئے طرفین کا خون بہانے کا نام نہیں۔

آخر میں سید صاحب نے جو نکتہ بیان فرمایا یہی اسلام کا اصل الاصول ہے کہ ہمارا اصل کام تو اشاعت توحید الٰہی ہے اور سید المرسلین صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت کو زندہ کرنا۔ جس ملک یا حکومت میں یہ کام ہو سکتا ہے اس کے خلاف جہاد کرنے کی

ضرورت ہی نہیں کیونکہ اسلام حصول اقتدار کے لئے تو نہیں آیا۔

ہمارے خیال میں سید احمد شہید نے بڑی وضاحت اور خوش اسلوبی سے جہاد کا حقیقی اور اسلامی نظریہ بیان کردیا کہ اس پر کسی اضافے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور ان کی تقریر سے صاف ظاہر ہوتا بلکہ ثابت ہو جاتا ہے کہ سید صاحب کے جہاد کا رخ سکھوں کی طرف تھا۔ انگریزوں سے جہاد کا خیال ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

اس تصور کا آغاز اس وقت ہوا جب برصغیر میں آزادی کی تحریکوں نے جنم لیا۔ سیاسی رہنماؤں نے عوام میں عزت و تکریم حاصل کی اور انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لینا عظمت کا سبب ٹھہرا۔ یہ دیکھ کر ہمارے بعض تذکرہ نگاروں اور مورخوں نے سید احمد شہیدؒ کی عظمت کو چمکانے کے لئے آپؒ کو بھی دنیادار سیاسی رہنماؤں کی صف میں لا کھڑا کیا اور سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے کے لئے ایسے ایسے بعید از قیاس دلائل پیش کئے کہ اہل نظر انگشت بدنداں رہ گئے۔ ان حضرات نے یہ موقف اختیار کیا کہ سید صاحب دراصل انگریزوں سے جہاد کرنا چاہتے تھے سکھ تو یونہی درمیان میں آ گئے۔ اس موضوع پر ہم اپنی کتاب "شہادت گاہ بالاکوٹ" میں تفصیل سے بحث کر چکے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس بحث کا کچھ حصہ یہاں نقل کر دیا جائے۔

"اگر واقعہ یہی ہوتا اور سید صاحب نے انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا ہوتا تو ہم بھی اس کا انکار نہ کرتے کیونکہ تاریخی حقائق کا انکار کرنا بہت بڑا اور ناقابل معافی جرم ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ کہنے کی بھی اجازت چاہیں گے کہ بالکل اسی طرح تاریخ کا چہرہ مسخ کرنا بھی جرم اور ناقابل معافی جرم ہے۔ کسی شخصیت کی حقیقی عظمت یہی ہے کہ اس سے وہی کارنامے منسوب کئے جائیں جو اس نے سرانجام دیئے ہوں لیکن یہ امر اس کی عظمت کو داغدار کرنے کا موجب ہوتا ہے کہ اس کی دستار عظمت میں وہ گہر بھی ٹانک دیئے جائیں جو اس کا حصہ نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی حقیقی عظمت بھی اس مبالغہ آرائی کے ہاتھوں مشکوک ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ سید صاحب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا اور انہیں انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے کی کوشش میں غلط نگاری اور مبالغہ آرائی دونوں کا سہارا لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

آپؒ کے ایک اور مخالف و متعصب ناقد کو یہ پھبتی کسنے کا موقع مل گیا کہ:۔

"سید صاحب کے جہاد کا رخ نگاہ نازنیں کی طرح ہر طرف ہے"۔

حالانکہ سید صاحب کے جہاد کا رخ نگاہ نازنیں کی طرح ہر طرف نہیں بلکہ ایک مرد میداں کی طرح صرف ایک طرف تھا اور وہ سمت تھی سکھوں کی ظالمانہ و مسلم کش حکومت۔ سب سے زیادہ حیرت اس پر ہے کہ سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے والوں نے اس حقیقت کو بھی نظرانداز کر دیا کہ اگر آپؒ نے انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا منصوبہ بنایا ہوتا تو یہ ہوشیار اور چالاک قوم کبھی اس سے بے خبر نہ رہتی۔ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ سید صاحب نے اپنے منصوبے کو انتہائی احتیاط سے پوشیدہ رکھا تو آپ کی شہادت کے بعد آپ کا یہ منصوبہ انگریزوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتا تھا جب کہ آپ کے بہت سے عقیدتمند انگریزوں سے مصالحت کرنے کے حق میں تھے اور بعض حضرات جیسے مولوی محبوب علی صاحب انگریز سے جہاد کرنے کے خلاف فتویٰ بھی دے چکے تھے۔ اگر سید صاحب کا منصوبہ انگریز سے جہاد کرنے کا ہوتا تو ان اصحاب کے ذریعے سے انگریزوں کو آپؒ کے منصوبے کا علم ہو جاتا اور آپؒ کے بعد کے انگریز مورخ و مصنف اس منصوبے سے آگاہ ہو کر ضرور اپنی کتابوں میں اس کا تذکرہ کرتے مگر یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مستند انگریز مصنفوں کی تاریخیں انگریزوں کے خلاف سید صاحب کے اس منصوبے کے ذکر سے قطعاً" خالی ہیں۔ سوائے ایک انگریز کے جس نے آپ کے بارے مین یہ بے سروپا بات کہہ دی کہ سید صاحب پنجاب سے لے کر ہندوستان اور چین تک کا علاقہ فتح کرنا چاہتے تھے۔ "چین کی فتح" کی بو نے اس خیال کی لغویت خود بخود آشکار کر دی۔

ولیم ولسن ہنٹر کی رائے

ولیم ولسن ہنٹر بنگال کا بہت مشہور انگریز آئی سی ایس افسر تھا۔ "آور انڈین مسلمانز" اس کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب میں اس انگریز افسر نے سارا زور قلم سید صاحب کی تحریک کی مخالفت پر صرف کر دیا۔ اس نے آپ کو وہابی کا خطاب دیا اور آپ

کی تحریک کو وہابیت سے موسوم کیا۔ سید صاحب کو ڈاکو، لٹیرا، چالباز غرض ہر اس خطاب سے نوازا جس سے ایک "برے" آدمی کو یاد کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سید صاحب کی پیدائش سے لے کر آپؒ کی تعلیم، نواب امیر خاں حاکم ریاست ٹونک سے وابستگی، آپؒ کی تحریک اصلاح و جہاد، سکھوں اور افغانوں سے جنگیں اور آپؒ کی شہادت تک ہر قابل ذکر واقعے کا ذکر کیا اور ان واقعات کا ذکر کرتے ہوئے آپؒ کے مرتبے کو جس قدر گرا سکتا تھا گرایا مگر اس نے اپنی کتاب میں اشارۃً بھی سید صاحب کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف قرار نہیں دیا حالانکہ اس کی کتاب کی تصنیف کا اصل مقصد ہی حکومت برطانیہ اور اس کے دوستوں کو اس خطرے سے باخبر کرنا تھا جو شمال مغربی صوبہ میں ان باغیوں کی صورت میں ابھر رہا تھا جن کے بارے میں ہنٹر کہتا ہے کہ یہ سید صاحب کے بقیۃ السیف مجاہدین ہیں۔ اس صورت میں تو اس کے لئے اور بھی ضروری تھا کہ وہ پہلے سید صاحب کو انگریزوں کا مخالف ظاہر کرتا اور دلائل سے ثابت کرتا کہ ان کا منصوبہ دراصل انگریزوں سے جہاد کرنے کا تھا، سکھوں کو شکست دے کر تو وہ اپنے لئے ایک قرارگاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں سے انگریزوں کے خلاف جہاد کا آغاز کرنا ان کا اصل پروگرام تھا۔ اس کے بعد صوبہ سرحد (ستھانہ اور امبیلا) کی باغی جماعت کے بارے میں یہ ثابت کرنا آسان تھا کہ وہ اپنے مذہبی عقیدے اور اپنے امام (سید احمد شہید) کی تعلیم اور منصوبے کے مطابق انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کو فرض عین سمجھتے ہیں۔

سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت کرنے کے بعد اس کے لئے آسان ہو جاتا کہ وہ ہندوستان میں مقیم لاکھوں مسلمانوں کو بھی جو سید صاحب کے عقیدت مند تھے انگریزوں کی نگاہ میں حکومت کا باغی ثابت کر دیتا۔ مگر اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اسے انگریزوں کے خلاف سید صاحب کے کسی منصوبے کا سراغ نہ مل سکا حالانکہ تمام سرکاری رپورٹیں، سراغ رسانوں کی اطلاعات، مختلف اضلاع کے ڈپٹی کمشنروں اور متعدد مقامات کی نگرانی کرنے والے انگریز افسروں کی جملہ دستاویزات اس کے سامنے تھیں ان سب سے اس نے استفادہ کیا۔ ہزاروں صفحات کے مطالعے اور چھان بین کے

باوجود اسے سید صاحب کے اس منصوبے کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو سکا جو آج کے بعض مورخ و محقق اپنی تحقیق کے شاہکار کے طور پر پیش کر رہے ہیں حالانکہ اس کا زمانہ مقابلتہ" سید صاحب کے زمانے سے قریب کا تھا یعنی سید صاحب کی شہادت پر چالیس سال گزرے تھے جب اس نے (23 جون 1871ء کو) اپنی کتاب مکمل کی۔ ظاہر ہے کہ 10,8 سال اس نے چھان بین میں صرف کئے ہوں گے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اس نے سید صاحب کی شہادت کے کم و بیش تیس سال بعد اپنے تحقیقی کام کا آغاز کیا جب کہ ایسے بہت سے لوگ بقید حیات تھے جنہوں نے براہ راست سید صاحب سے بیعت کی تھی اور بعض ایسے لوگ بھی زندہ تھے جو ابتدا میں سید صاحب کے ساتھ تھے ان کے ہمراز تھے مگر بعد میں ان سے منحرف ہو گئے۔ ہماری مراد پشاور اور ہزارہ کے خوانین سے ہے مگر ان مستند ذرائع معلومات کے باوجود ہنٹر جو کچھ لکھ سکا وہ یہ ہے:-

"1824ء میں (سید صاحب) سرحد پشاور کے مہذب کوہستانی قبائل میں نمودار ہوئے۔ اس علاقے میں پہنچ کر انہوں نے سکھ حکومت کے خلاف مقدس جنگ (جہاد) کی تلقین شروع کی۔ پٹھان قبائل میں ان کی دعوت کا نہایت پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ انہوں نے پہاڑی قبائل کے سوجھ بوجھ رکھنے والے سرداروں کو اس خطرے کے سدباب کی طرف متوجہ کیا جو ان کے پڑوس میں سکھ طاقت کی صورت میں روز بروز بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک فرمان جاری کیا اس میں کہا گیا تھا کہ "سکھ قوم ایک عرصے سے لاہور اور دوسرے متعدد علاقوں پر قابض ہے۔ ان کا ظلم و ستم حد سے تجاوز کر چکا ہے ہزارہا بے گناہ مسلمانوں کو تہہ تیغ کیا جا چکا ہے ہزاروں کو بے عزت اور رسوا کیا گیا ہے۔ مساجد میں اذان دینا ممنوع ہے۔ گاؤ کشی قطعی طور پر روک دی گئی ہے۔ آخر ان کے ظلم و ستم کو مسلمانوں کے لئے ناقابل برداشت پا کر سید صاحب نے اسلام کی حفاظت و سربلندی کی خاطر مخلصین کی مختصر سی جماعت کے ہمراہ کابل اور پشاور کا سفر اختیار کیا اور وہاں کے مسلمانوں کو جو خواب غفلت میں مدہوش پڑے تھے جھنجوڑا۔ اس مقصد میں انہیں کامیابی ہوئی اور یہاں کے مسلمانوں میں جذبہ ہمت و جرات بیدار ہو گیا۔ ہزارہا مسلمان ان کی دعوت پر اٹھ کھڑے ہوئے اور راہ خدا میں اپنی جانیں قربان

کرنے کے لئے کمربستہ ہو گئے۔ واضح ہو کہ 20 جمادی الثانی 1242ھ (مطابق 21 دسمبر 1826ء) کو جہاد کا آغاز کر دیا جائے گا"۔(2)

یہ سارا بیان بلکہ ہنٹر کی ساری کتاب پڑھ جائیے۔ اس میں کہیں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ہنٹر سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل سمجھتا تھا۔ اگر وہ کسی نتیجے تک پہنچا تو صرف یہ تھا کہ سید صاحب نے تعلیم اور عسکری تربیت کے مرحلے طے کرنے کے بعد ملک گیر دورے کئے۔ مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی‘ انہیں سکھوں سے جہاد کے لئے آمادہ کیا اور پھر مختصر سی جمعیت لے کر صوبہ سرحد روانہ ہو گئے۔ پشاور کی حدود میں پہنچ کر انہوں نے افغانوں میں جہاد کی تحریک کی‘ انہیں ان کے پڑوس میں ابھرتی ہوئی زبردست سکھ طاقت کے خطرے سے آگاہ کیا اور باقی ساری عمر سکھوں سے نبرد آزمائی میں گزاری۔

یہ ہے اس انگریز محقق کی تحقیق کا نچوڑ جس نے سید صاحب کا قریبی زمانہ پایا تھا اور جو ان کا سب سے بڑا اور پہلا غیر ملکی ناقد اور تذکرہ نگار تھا۔ ہر منصف مزاج شخص اس کا بیان پڑھ کر یہی نتیجہ نکالے گا کہ سید صاحب کا شدید مخالف ہوتے ہوئے انہیں جعل ساز‘ ڈاکو‘ لٹیرا اور "مرگی زدہ" قرار دینے کے باوجود وہ سید صاحب کو انگریزوں کا مدمقابل ثابت نہ کر سکا۔ بلکہ اس کے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ خیال تک نہ آیا۔

اولف کیرو کا تبصرہ

سید صاحب کا دوسرا انگریز تذکرہ نگار سر اولف کیرو ہے جو عرصے تک صوبہ سرحد کا گورنر رہا اور جس نے طویل تحقیق کے بعد افغانوں کے قبائل‘ ان کی تہذیب اور ان کی جنگوں پر "دی پٹھانز" کے نام سے ایک مبسوط کتاب سپرد قلم کی۔ اپنی اس تحقیقی کتاب میں اس نے ایک باب سید صاحب کے متعلق بھی لکھا ہے جس کا عنوان ہے "سید احمد بریلوی اینڈ دی سکھس" اس باب میں اس نے سید صاحب اور ان کی تحریک کے عروج و زوال کی داستان قلم بند کی ہے مگر اس نے بھی سید صاحب کے کسی

ایسے منصوبے کا ذکر نہیں کیا جس کا مقصد انگریزوں سے جہاد کرنا تھا۔ اولف کیرو نے ان کی تحریک کا جائزہ لینے کے بعد جو نتیجہ نکالا وہ یہی تھا کہ سید صاحب کا جہاد سکھوں کے خلاف تھا چنانچہ اس کا بیان ہے کہ:-

"اب جو مصلح ظاہر ہوا وہ سکھوں کی نئی قائم شدہ طاقت کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا اور وہ اس قابل تھا کہ ظالم کے ماتحت زندگی گزارنے والے مظلوم مسلمانوں کو متحد کر کے ان کافروں کے خلاف صف آراء کر دے اس مجاہد کا نام سید احمد تھا"۔(3)

اگر اس انگریز مصنف کو ذرا سا بھی شبہ ہو جاتا کہ سید صاحب کی تحریک کا اصل مقصد انگریزوں سے جہاد کرنا تھا تو ناممکن تھا کہ وہ اس کا تذکرہ نہ کرتا جب کہ اس کے زمانے میں سید صاحب کی تحریک سے متعلق بہت سے نئے مآخذ سامنے آ چکے تھے۔ اس خاصے طویل باب میں اس نے سید صاحب کی تحریک کے متعدد پہلوؤں کا جائزہ لیا مگر اس طرف خفیف سا اشارہ بھی نہ کر سکا کہ سید صاحب کا رخ جہاد انگریزوں کی طرف تھا بلکہ اگر کچھ لکھ سکا تو یہ کہ "سید احمد شاہ نے سکھوں کی ظالمانہ حکومت کے تحت اذیت ناک زندگی گزارنے والے مومنوں کو متحد کر کے ان کافروں کے خلاف صف آرا کیا"۔

مولوی جعفر تھانیسری کی رائے

سید صاحب کے عقیدت مندوں میں مولانا محمد جعفر تھانیسری بڑے پائے کے شخص گزرے ہیں۔ اردو زبان میں سید صاحب پر سب سے پہلی مستقل کتاب "سوانح احمدی" انہی جعفر تھانیسری کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اور اس کے مستند ہونے کا اندازہ لگانے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ بعد کے مصنفوں اور سید صاحب کے تذکرہ نگاروں میں ایک بھی ایسا نہیں جس نے مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "سوانح احمدی" سے استفادہ نہ کیا ہو۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جو مصنف کے زمانے میں موجود تھیں مگر اب ناپید ہیں۔ مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں بیس مقامات پر اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ سید صاحب کا جہاد سکھوں سے تھا۔ انگریزوں سے نہ صرف یہ کہ ان کا جہاد

نہیں تھا بلکہ ان کے خلاف جہاد کرنے کو وہ بلوہ قرار دیتے تھے اور اسے کتاب و سنت کے منافی سمجھتے تھے۔ مگر افسوس کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت بعض مورخوں نے سرے سے مولانا جعفر تھانیسری کی مستند حیثیت ہی کو مشتبہ قرار دے دیا اور ان پر تحریف کا الزام عائد کیا۔ یہ اس لئے کیا گیا کہ مولانا جعفر تھانیسری کے حقیقت پر مبنی بیانات ان فاضل محققوں کے مفروضات کے خلاف جا رہے تھے ورنہ اس سے پہلے ایسی جسارت کسی نے نہ کی بلکہ مولانا جعفر تھانیسری کو نہ صرف سید صاحب کا مستند تذکرہ نگار بلکہ ان کا عاشق صادق اور فدائی قرار دیا گیا۔ چنانچہ ہمارے زمانے کے ایک فاضل اور تحریک مجاہدین کے قلبی ہمدرد مولانا مسعود عالم ندوی نے اپنی معرکتہ الآراء کتاب میں مولانا جعفر تھانیسری کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

مولانا مسعود عالم ندوی کی رائے

"منشی محمد جعفر تھانیسری عمر 28 سال (یہ عمر اس وقت تھی جب مولانا پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلا تھا) ساکن تھانیسر ضلع انبالہ تمام اسیران بلا میں یہ سب سے زیادہ ہوشیار اور معاملہ فہم تھے۔ پورے مقدمے کے دوران میں انہوں نے کوئی وکیل نہیں مقرر کیا اور بڑی قابلیت کے ساتھ گواہوں پر جرح کی۔ مولوی عبدالرحیم کے ساتھ یہ بھی رہا ہوئے اور ایک عرصہ آزاد رہ کر 1905ء میں رحلت کی۔ سید صاحب کی قائم کی ہوئی جماعت میں یہی ایک ذمہ دار آدمی ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ 57ء کے ہنگامے میں شرکت کی"۔(4)

پھر آگے چل کر مولانا ندوی نے مولانا جعفر تھانیسری کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ان پانچ بزرگوں میں سے تھے جو:-

"تمام ابتلاؤ آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اپنی ثابت قدمی سے عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی"۔(5)

غور کرنے کا مقام ہے اور کتنے ستم کی بات ہے کہ سید صاحب کی قائم کی ہوئی جماعت کے ایک ذمہ دار رکن اور "عہد صحابہ کی یاد تازہ کرنے والے بزرگ" کو جعل

ساز قرار دیا گیا اور اس پر تحریف کا الزام عائد کیا گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ثبات قدم اسی کا نام ہے؟ صحابہ ایسے ہی ہوتے تھے؟ اور ان کے عہد کی یاد ایسے ہی لوگوں سے عبارت ہے۔ جو شخص آہن گداز مصائب و آلام میں بھی ثابت قدم رہا وہ کسی مصلحت یا ذاتی مفاد کی خاطر اپنے امام و مرشد کی تحریروں میں تحریف کا مرتکب کیسے ہو سکتا تھا۔

ہمارے عہد کے ایک فاضل مولف پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری مولانا جعفر تھانیسری کی کتاب "تواریخ عجیبہ" کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حقیقت یہ ہے کہ مولوی محمد جعفر (جماعت مجاہدین کے) خاص رازدار تھے جس کے نتیجے میں انہوں نے خوفناک تکلیفیں اٹھائیں' گھر بار لٹایا' ہزاروں کی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے محروم ہوئے' بیوی بچوں کو چھوڑا' عزت و دولت سے محروم ہوئے' زندگی کے بہترین اٹھارہ سال جنگلوں اور پہاڑوں (جزائر انڈمان) میں قیدی کی حیثیت سے گزارے"۔(6)

اس کے بعد یہ کہنا کہ مولانا جعفر نے پولیس کی نگرانی سے گھبرا کر اپنے ذاتی مقصد کے حصول کے لئے سید احمد شہید کے بعض مکتوبات کی عبارتیں بدل دیں اتنی بڑی زیادتی اور ناانصافی ہے کہ اس پر سوائے انا للہ پڑھنے کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ حیرت ہے کہ جس شخص نے اس راہ میں خوفناک تکلیفیں اٹھائیں' گھر بار لٹایا' ہزاروں کی منقولہ و غیر منقولہ جائیداد سے ہاتھ دھوئے' بیوی بچوں کو چھوڑا' عزت و دولت سے محروم ہو کر اپنی زندگی کے بہترین اٹھارہ سال کالا پانی کے جنگلات میں گزار دیئے مگر اس کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی لیکن جب وہ اس بھٹی سے کندن بن کر نکل آیا اور سارے مصائب کا خاتمہ ہو گیا تو صرف پولیس کی نگرانی کے خوف سے اس نے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کیا کہ جعل ساز مشہور ہوا۔ کیا کوئی عقلمند یہ بعید از عقل بات تسلیم کرے گا؟

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے مکتوبات تھے جن کی عبارتیں مولانا جعفر تھانیسری نے بدل ڈالیں۔ مولانا مہر نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں بعض مکتوبات کے اقتباسات پیش کئے ہیں اور ان کا مقابلہ ان مکتوبات کے اقتباسات سے کیا ہے جو

مولانا جعفر تھانیسری نے اپنی کتاب میں درج کئے ہیں۔ غور طلب امر یہ ہے کہ جو نقل شدہ خطوط مولانا مہر پیش کرتے ہیں اس کا کیا ثبوت ہے کہ خود ان میں تحریف نہیں ہوئی یہ کوئی آسمانی صحیفہ تو نہیں قرآن کریم کے سوائے صحائف آسمانی بھی تحریف سے نہ بچ سکے۔ پھر یہ خطوط بھی اصلی نہیں بلکہ نقل شدہ ہیں۔ کیوں نہ یہ سمجھا جائے کہ مولانا جعفر تھانیسری کے سامنے جو مکتوبات تھے ان میں وہی عبارتیں تھیں جو مولانا جعفر تھانیسری نے پیش کی ہیں۔ پھر یہ کہ مولانا جعفر تھانیسری سید صاحب کے زمانے کے قریب کے مصنف تھے۔ ان کی وفات (1905ء) کے بعد گزشتہ قریباً اسی سال میں جعل سازی کا کاروبار زور شور سے شروع ہوا اور اسی دوران سید صاحب کے جہاد کا رخ سکھوں کی طرف سے پھیر کر انگریزوں کی طرف ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کے مکتوبات میں تحریف اگر ہوئی ہو گی تو اسی دوران ہوئی ہو گی اور انہی لوگوں نے کی ہو گی جنہیں سید صاحب کو بھی کانگریس کے لیڈروں کی طرح سیاسی لیڈر بنانے کا شوق تھا' بہرحال یہ ایک فضول بحث ہے جس کا فیصلہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ معقول طریقہ یہ ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری کا عمومی کردار' ان کی تحریک مجاہدین سے وفاداری اور عدیم النظیر استقامت دیکھ کر فیصلہ کرنا چاہئے کہ کیا ان جیسے کردار کے آدمی سے جعل سازی کا مکروہ فعل منسوب کیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اپنے مرشد اور امام کی تحریروں میں۔

مولانا جعفر کی انگریز دشمنی

یہ ایک حقیقت ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری انگریزی حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ اسی جذبے نے انہیں حکومت کے خلاف وہ اقدام کرنے پر مجبور کیا جس نے انہیں پھانسی کی کوٹھری میں پہنچا دیا۔ واپسی پر انہوں نے دو ایسی کتابیں لکھیں جن میں انگریزوں کو جارح اور ظالم قرار دیا۔ اگر انہیں حکومت کی خوشنودی حاصل کرنی ہوتی تو ایسی سخت قید کاٹنے کے بعد وہ اپنا رویہ تبدیل کر لیتے اور بقیہ ساری زندگی حکومت کے گن گانے میں گزار دیتے مگر انہوں نے اس کے برعکس روش اختیار کی چنانچہ انہوں نے اپنی کتاب "تواریخ عجیبہ" کا آغاز جن الفاظ سے کیا وہ یہ ہیں:-

"اخیر 1863ء مطابق 1280 ہجری میں سرحد ہند پر ملک یاغستان میں خود سرکار انگریزی کی زبردستی سے ایک جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ جنرل چیمبرلین صاحب اس جنگ کے سپہ سالار تھے۔ امبیلہ کی گھاٹی میں جا کر فوج سرکار کو بہت تکلیف ہوئی۔ بیگانے ملک میں سرکار کی مداخلت بے جا کے سبب ملا عبدالغفور صاحب اخوند سوات بھی اپنے بہت سے مریدوں کو ساتھ لے کر آ موجود ہوئے۔ ملکی خوانین اور افغان چاروں طرف سے اپنے بچاؤ کے واسطے مقابلہ سرکار پر ٹوٹ پڑے۔ قافلہ مجاہدین جن کی سرکوبی اور نیست و نابود کرنے کو ہماری سرکار چڑھی تھی الگ رہ گیا مگر بدعوی حفاظت خود اختیاری ہر کس و ناکس سرکار کے مقابل کھڑا ہو گیا۔ مجاہدوں نے بھی بہ تمنائے حصول شہادت داد شجاعت دے کر اپنے جوہر دکھائے۔ غرض دو تین مہینے تک خوب جنگ ہوتی رہی۔ خود جنرل چیمبرلین صاحب مجروح شدید ہوئے۔ قریب سات ہزار کے کشت و خون کی نوبت پہنچی۔ تمام پنجاب کی چھاؤنیوں کی فوج کھینچ کر سرحد پر بھیجی گئی۔ ادھر یہ گرما گرمی تھی ادھر لارڈ ایلجن صاحب وائسرائے ہند چمبہ کی پہاڑی پر اپنی اس حرکت اور زبردستی چھیڑ چھاڑ پر نادم ہو کر یک بیک مر گئے"۔(7)

اپنی دوسری کتاب "سوانح احمدی" میں مولانا جعفر تھانیسری نے پھر برطانوی حکومت کی جارحانہ پالیسی پر نہ صرف تنقید کی بلکہ اسے چنگیز اور ہلاکو سے تشبیہ دی۔ چنانچہ ان کے یہ الفاظ خاص طور سے قابل ذکر ہیں:-

"سکھوں کی آمد کی علامت آگ کے شعلے اور دھواں ہوتا تھا جس قدر وہ بڑھتے تھے گاؤں اور بستیوں کو پھونکتے اور مسجدوں اور مدرسوں کو گراتے چلے جاتے تھے۔ چنگیز خاں' ہلاکو اور تیمور لنگ وغیرہ پرانے ظالموں کی راہ کی علامت بھی مورخوں نے یہی آگ اور دھواں لکھی ہے اور ہماری "مہذب سرکار" نے بھی ملک یاغستان کے واسطے وہی چنگیز خانی قاعدہ آتش زنی کا اختیار کر رکھا ہے۔ **اللھم زدفزد**"۔(8)

ہم نے یہ دونوں حوالے بے کم و کاست نقل کر دیئے ہیں۔ کیا ان کی عبارتیں پڑھنے کے بعد صاف طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ مولانا جعفر تھانیسری انگریزی حکومت کو جلی کٹی سنا رہے ہیں۔ انہیں ظالم و جارح قرار دے رہے ہیں یاغستان میں مداخلت

بے جا کا مرتکب ٹھہرا رہے ہیں۔ مجاہدین کی بہادری اور انگریزوں کے مقابلے پر ان کی
شجاعت کا ذکر کر کے انہیں خراج تحسین ادا کر رہے ہیں انگریزی فوج کے نقصان پر خوش
ہیں۔ حتیٰ کہ وائسرائے ہند کی اچانک موت کا ذکر نہایت خوشی کے رنگ میں کر رہے
ہیں۔ اگر انہیں انگریزوں سے کچھ فوائد حاصل کرنے ہوتے، پولیس کی نگرانی سے محفوظ
رہنا ہوتا اور عمر قید سے رہائی کے بعد باقی زندگی آرام سے گزارنے کی آرزو ہوتی تو کیا وہ
اپنی کتابوں میں انگریزوں کا ذکر اس اہانت آمیز طریقے سے کرتے؟ انہیں یوں بدنام کر
کے خود کو ان کی نظر میں معتوب بناتے؟ کیا اس سے ثابت نہیں ہو جاتا کہ گرفتاری سے
پہلے بھی وہ انگریزوں کے مخالف تھے اور رہائی کے بعد بھی ان کی اس روش میں فرق نہ
آیا اور انہیں جہاں موقع ملا انگریزوں کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔ ایسے صاف
گو اور جرات مند شخص کے متعلق یہ کہنا کتنا بڑا ظلم ہے کہ اس نے ذاتی مصلحت کی
خاطر سید صاحب کو انگریزوں کا حامی ثابت کیا اور قید سے رہائی کے بعد انگریزوں کا ہوا
خواہ بن گیا۔ شاید ہی کسی محسن قوم کو ایسا بدترین صلہ دیا گیا ہو جیسا مولانا جعفر
تھانیسری کو دیا گیا۔

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ مولانا جعفر تھانیسری نہایت بے خوف اور
با اصول انسان تھے اور مولانا مسعود عالم ندوی کے بقول "مولانا جعفر تھانیسری نے ہر
آزمائش و ابتلا میں ثابت قدم رہ کر عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی"۔ اب دیکھئے کہ عہد صحابہ
کی یاد تازہ کرنے والا یہ عالم اور سید احمد شہید کا تذکرہ نگار کیا لکھتا ہے۔

سید صاحب نے فرمایا "کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ
انگریزوں کا ملک لینا ہی ہمارا مقصد ہے نہ سکھوں کا ___ سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے
مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے
روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب
طرفین کا خون بلاسبب گراویں"۔ (9) پھر آپ نے فرمایا "ہمارا اصل کام اشاعت توحید
الٰہی اور احیاء سنن سید المرسلینؐ ہے"۔

دنیا میں جتنے بھی انبیا و مجددین آئے ان سب نے اپنا مقصد وحید یہی قرار دیا کہ

انسانیت کے گم کردہ راہ قافلے کو اس کی اصل منزل مقصود کی طرف گامزن کرنا اللہ کے
بندوں کو جو اس سے دور ہو چکے تھے اس کے قریب لانا، دکھی انسانیت کو آرام پہنچانا اور
مذہب خالص کو گرد و غبار سے پاک و صاف کر کے اس کا حقیقی اور تابناک چہرہ دنیا کے
سامنے پیش کرنا۔ جنگیں لڑنا اور دوسروں کے دیار و امصار پر قبضہ کرنا انبیاء و صلحا نے
کبھی اپنا مقصود و مدعا قرار نہیں دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں ان کے دشمنوں نے جنگ
و پیکار پر مجبور کیا اس صورت میں انہیں دفاعی جنگ لڑنی پڑی لیکن جب تک کوئی ان کے
کام میں مزاحم نہیں ہوا انہوں نے کسی سے تعرض نہیں کیا کیونکہ ان کا اصل مدعا توحید
الٰہی کا قیام اور احیائے دین پورا ہو رہا تھا۔ سید احمد شہید بھی صلحائے امت میں سے تھے
اپنے عہد میں وہ مسلمانوں کے روحانی پیشوا تھے اپنے زمانے کے امام تھے۔ یہی وجہ ہے
کہ انہوں نے بھی صلحائے سابق کی طرح اپنا اصل مقصد اشاعت توحید الٰہی اور سید
المرسلینؐ کی سنت کو زندہ کرنا قرار دیا چونکہ انگریز ان کے اس اصل اور بنیادی کام میں
مزاحم نہیں ہو رہے تھے اور آپؒ انگریزوں کی سلطنت میں دہلی سے کلکتہ تک بے روک
ٹوک آزادانہ تبلیغ و تلقین کر رہے تھے اس لئے آپؒ نے ان سے جہاد کی ضرورت
محسوس نہیں فرمائی البتہ چونکہ پنجاب میں مسلمانوں پر سخت مظالم ہو رہے تھے، ان کی
مسجدیں اصطبل بنا دی گئی تھیں، اذان کہنے، گائے ذبح کرنے اور اللہ کی عبادت کرنے
سے روک دیا گیا تھا۔ ان کی جان و مال حتیٰ کہ ان کی عورتوں کی عصمتیں لٹ رہی تھیں
اس لئے سید صاحبؒ ان علاقوں کے مسلمانوں کو سکھ حکومت کے انسانیت سوز مظالم
سے نجات دلانے تشریف لے گئے اور اس ظالم اور مداخلت فی الدین کرنے والی حکومت
کے خلاف جہاد کیا۔

مولانا غلام رسول مہر کا تائیدی حوالہ

ہمارے زمانے کے ایک فاضل مورخ غلام رسول مہر (مرحوم) ان چند تذکرہ
نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص سیاسی نظریات کے تحت سید صاحبؒ کے
جہاد کا رخ سکھوں کی طرف سے موڑ کر انگریزوں کی طرف دکھانے کی کوشش کی۔ بلاشبہ

مہر صاحب بڑے فاضل آدمی تھے اور مرحوم نے بڑی قابلیت سے اپنے مقدمے کی وکالت کی لیکن ایک کمزور مقدمہ دنیا کا قابل سے قابل وکیل بھی نہیں جیت سکتا یہی صورت اس معاملے کی ہے۔ مہر صاحب نے جس مقدمے کی پیروی کی وہ مقدمہ ہی بے جان ہے اس لئے ان کے علم و فضل پر ہرگز حرف نہیں آتا۔ یہ وہ مشین ہے جس کی کوئی کل سیدھی نہیں کوئی پرزہ درست نہیں۔ اس کی مثال وہی ہے کہ اگر سر چھپاؤ تو پیر کھل جاتے ہیں اور اگر پیر چھپاؤ تو سر کھل جاتا ہے۔ خود مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے قلم سے سید صاحب کے بارے میں خود انہی کی روایت درج ہو گئی پہلے وہ روایت پڑھ لیجئے مہر صاحب نے اپنی کتاب "سید احمد شہید" میں سید صاحب کی ایک تقریر نقل کی ہے۔ اس تقریر میں سید صاحب نے جہاد کی فضیلت بیان کرنے کے بعد اہل مجلس کو بتایا کہ مجھے جناب باری سے جہاد فی سبیل اللہ کا فریضہ انجام دینے کا حکم ہوا ہے۔

"کتنے لوگوں نے صلاح دی کہ اسی ملک (یعنی ہندوستان) میں جہاد کر کے جو کچھ مال خزانہ سلاح (اسلحہ) وغیرہ درکار ہوں ہم دیں گے۔ مجھ کو منظور نہ ہوا اس لئے کہ جہاد موافق سنت کے چاہیئے بلوا کرنا منظور نہیں"۔ (10)

سید صاحب کے یہ الفاظ جن کی صحت کی مولانا مہر تائید کرتے ہیں باآواز بلند اعلان کر رہے ہیں کہ سید صاحب انگریزوں سے جہاد کو بلوا قرار دیتے تھے اور سید صاحب کو بلوا کرنا منظور نہیں تھا۔ آخر کوئی بتائے کہ جب ہندوستان میں ان کے عقیدتمند ہزاروں ہزار کی تعداد میں تھے، برطانوی فوج کے ہزاروں سپاہی ان کے مرید ہو چکے تھے، آپؒ کے عقیدتمند دعوت دے رہے تھے کہ آپ ہندوستان میں رہ کر جہاد کریں کیونکہ سینکڑوں میل کا سفر طے کر کے افغانستان کے پہاڑوں سے گزر کر پھر پنجاب جانا ہمارے لئے مشکل ہے۔ وہ آپؒ کو خزانہ، اسلحہ اور جنگجو افراد سب کچھ مہیا کر رہے تھے پھر سید صاحب نے یہ دعوت کیوں قبول نہ کی۔ جہاد کے لئے انہی تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے روپیہ، اسلحہ اور جنگجو افراد اور یہ تینوں چیزیں موجود تھیں پھر روہیلکھنڈ کے علاقے میں ہزاروں پٹھان آپؒ کے مرید تھے جن کی عمریں داد شجاعت دیتے گزر گئی تھیں۔ ریاست ٹونک کے حاکم نواب امیر خاں آپ کے عقیدتمند تھے یعنی

ایک مرکز موجود تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود آپؒ نے یہ درخواست رد کر دی۔ اس سے صریح طور پر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا جعفر تھانیسری نے سید صاب سے جو تقریر منسوب کی ہے کہ "سرکار انگریزی دینی امور میں ہماری مزاحمت نہیں کرتی پھر ہم کیوں اس سے لڑیں اور بلاوجہ ایک دوسرے کا خون بہائیں"۔ یہ تقریر سو فیصد درست ہے اور مولانا غلام رسول مہر کی مندرجہ بالا روایت سے اس کی پوری تائید ہوتی ہے یعنی انگریزوں کے خلاف جہاد کرنا سید صاحب کے نزدیک بلوا کرنے کے مترادف تھا اور سید صاحب اسے پسند نہ فرماتے تھے بلکہ خلاف سنت سمجھتے تھے۔

جہاد بادراز مویاں

سید صاحب نے علاقہ یوسف زئی میں پہنچ کر ہندوستان کے اکابر، اپنے عقیدتمندوں اور افغان سرداروں کو متعدد مکتوبات لکھے۔ ان مکتوبات میں آپؒ نے نہایت وضاحت سے تحریر کیا کہ انہیں سکھوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا ہے اور سکھوں کے مظالم سے پنجاب اور سرحد کے مسلمانوں کو نجات دلانا وقت کی اہم ضرورت اور اسلام کی بہت بڑی خدمت ہے۔ چنانچہ آپؒ نے اپنے ایک عقیدتمند نواب فقیر محمد خاں گویا کو لکھا کہ:-

"میرے معاملے کو شعراء کی خیال آرائی اور فصحا کی فصاحت و بلاغت پر محمول نہ کرو جو عبارت کی سجاوٹ اور پر شکوہ الفاظ سے کلمات لطیفہ ترتیب دیتے ہیں اور پھر اس نازک خیالی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ میرا کلام وحی و الہام کا لب لباب ہے"۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:-

"..... امابیان الہام پس از فقیراز پردہ غیب بہ بشارات ربانی باستیصالی کفار دراز مویاں مامور است......"۔ (11)

(وہ الہام یہ ہے کہ اس فقیر کو غیب سے لمبے بالوں والے کافروں (سکھوں) سے جہاد کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے پر ربانی بشارتوں کے ذریعے مامور کیا گیا ہے۔ یہ ایسی بشارات ہیں جن میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں ہو سکتا)

سید صاحب کا دوسرا خط فیض اللہ خاں مہمند مشیر و دبیر والئی پشاور کے نام ہے جس میں آپ نے پھر اس امر کی وضاحت فرمائی ہے کہ "مجھے سکھوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ یہ اضافہ کہیں نہیں کیا کہ ان پر فتح پانے کے بعد میرا رخ جہاد انگریزوں کی طرف ہو گا چنانچہ سید صاحب لکھتے ہیں:۔

"برائے فطانت پیرائے ایشاں معاملہ ایں خاکسار کالشمس فی رابعتہ النہار ہویدا و آشکار است کہ بجہاد اہل عناد قوم سکھ مامورم"۔

(اس عاجز کا معاملہ آپ کی ذہانت و فراست پر آفتاب نیم روز کی مانند ظاہر ہے کہ میں (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) سکھ قوم سے جہاد پر مامور کیا گیا ہوں جو مسلمانوں کی دشمن ہے)۔

سید صاحب کے یہ وہ مکتوبات ہیں جن کے بارے میں آج تک کسی نے یہ اعتراض نہیں کیا کہ ان میں تحریف کی گئی ہے۔ ہم نے ان مکاتیب کی اصل فارسی عبارتیں پیش کر دی ہیں اور فیصلہ قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ سید صاحب کا جہاد انگریزوں سے تھا یا سکھوں سے؟ ان کے سارے مکتوبات پڑھ جائیے بلکہ ان کے تمام نسخے دیکھ لیجئے کسی ایک جگہ بھی کوئی ایک فقرہ ایسا نہیں ملے گا جس سے یہ مفہوم نکلتا ہو کہ آپ کو انگریزوں سے جہاد کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ اگر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انگریزوں کے استیصال اور ان سے جہاد پر مامور کیا جاتا تو آپ اپنی تقریروں میں انگریزی حکومت کو پر امن حکومت اور اس سے جہاد کو بلوا نہ قرار دیتے۔ ہم سید صاحب کے بارے میں مداہنت کا تصور بھی نہیں کر سکتے اگر آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انگریزوں سے جہاد پر مامور کیا جاتا تو ناممکن تھا کہ وہ اس کا اظہار نہ فرماتے اگر کسی اور کو نہیں تو کم از کم آپ کے قریب ترین رازداروں کو تو اس کا علم ہوتا۔ جہاد یا جنگ کا کوئی منصوبہ کوئی شخص تنہا نہیں بناتا اس کے رفقا، مشیر اور عقید تمند اس میں شریک ہوتے ہیں اس لئے اگر ایسا کوئی منصوبہ تھا تو آپ کے بعد آپ کے بقیۃ السیف رفقا کو تو اس کا علم ہوتا۔

نواب وزیر الدولہ بہادر فرماں روائے ریاست ٹونک کی ہدایت پر جو سید صاحب کے شاگرد اور مرید تھے ان کے بقیۃ السیف ہمراہیوں نے سید صاحب کی تحریک جہاد کے

چشم دید حالات املا کرائے جو "وقائع احمدی" کے نام سے کئی جلدوں میں مرتب ہوئے مگر ابھی تک شائع نہیں ہوئے۔ یہ کام ریاست ٹونک میں کئی سال تک جاری رہا۔ اگر سید صاحب کا انگریزوں سے جہاد کا کوئی منصوبہ ہوتا تو ان کے ان مریدان خاص میں سے کسی کو تو اس کا علم ہوتا اور وہ اس کتاب میں درج کرواتا۔ مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب کا بیشتر حصہ اسی کتاب سے تیار کیا ہے اس کے باوجود وہ "وقائع احمدی" سے ایک حوالہ اس قسم کا پیش نہ کر سکے جس سے ثابت ہوتا ہو کہ سید صاحب کے معتمدین اور مریدان خاص کو تو اس منصوبے کا علم نہ ہو سکا مگر ان کی شہادت کے ایک سو بیس سال بعد ان کے منصوبے کا علم ہوا ع

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

نواب صدیق حسن خاں کی رائے

نواب صدیق حسن خاں اپنے زمانے کے جید عالم گزرے ہیں جنہیں علمی اور دنیاوی دونوں وجاہتیں حاصل تھیں۔ ان کے والد ماجد علامہ اولاد حسن قنوج کے رئیس اور نہایت صاحب علم و فضل بزرگ تھے۔ حضرت شاہ عبد العزیز اور شاہ عبد القادر سے تعلیم حاصل کی۔ سید احمد شہید کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس لحاظ سے نواب صدیق حسن خاں کو سید صاحب کے کارناموں اور آپ کے عقائد و نظریات کا ہمارے زمانے کے بڑے سے بڑے عالم اور مورخ و محقق سے کہیں زیادہ علم تھا کہ ان کے والد ماجد سید صاحب کے مرید تھے اور گھر میں شب و روز آپ کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ نواب صدیق حسن خاں کا زمانہ بھی سید صاحب کے زمانے کے بہت قریب کا تھا اس لئے ان کی روایت بعد کے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول اور معتبر سمجھی جائے گی وہ ذاتی طور پر نہایت نیک نفس، راست باز اور دین دار انسان تھے۔ ان کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی دنیاوی مصلحت کی وجہ سے انہوں نے کذب بیانی اور جعل سازی سے کام لیا ہو گا۔ نواب صاحب موصوف سید صاحب کی شخصیت اور ان کے کارنامہ جہاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

"سید احمد شاہ ساکن نصیر آباد رائے بریلی میں ایک شخص تھے جنہوں نے بہت خلق کو نماز روزے پر قائم کیا اور گناہوں اور فساد کے کاموں سے روکا اور پھر وہ ہندوستان سے چلے گئے۔ اطراف پنجاب میں سکھوں سے لڑے------- (12) وہ کلکتہ تک گئے اور ہزاروں مسلمان فوج انگریزی کے ان کے مرید ہوئے تھے مگر انہوں نے کبھی یہ ارادہ (یعنی انگریزوں سے جہاد) ساتھ سرکار انگریزی کے ظاہر نہیں کیا اور نہ سرکار نے ان سے کچھ تعرض فرمایا"۔ (13)

اس کے بعد نواب صدیق حسن خاں نے اس کتاب میں پھر سید صاحب کا ذکر کیا ہے اور اس خیال کی سختی سے تردید فرمائی ہے کہ آپ کے جہاد کا رخ انگریزوں کی طرف تھا۔ چنانچہ نواب صاحب لکھتے ہیں:۔

"سید احمد شاہ بریلوی اور ان کے طریقے کے (لوگوں) نے تو کبھی نام بھی جہاد کا گورنمنٹ سے ہندوستان کی سرحد میں نہیں لیا"۔ (14)

نواب صدیق حسن خاں کو سید صاحب سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی اس لئے انہوں نے اپنی متعدد کتابوں میں جگہ بہ جگہ ان کا ذکر کیا ہے۔ "ترجمان وہابیہ" میں انہوں نے واقعاتی اعتبار سے اس خیال کی تردید کی ہے کہ سید صاحب کا ارادہ انگریزوں سے جنگ کرنے کا تھا۔ اپنی دوسری کتاب "تقصار جنود الاحرار" میں انہوں نے اس مسئلے کو علمی رنگ میں بیان کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:۔

"چوں اتفاق مراجعت از حرمین شریفین ہوای جہاد سرایشاں افتاد در ہند ایں معرکہ بحسب قواعد شرعیہ راست نمی آید"۔ (15)

(جب آپ حرمین شریفین سے واپس ہوئے تو آپؒ میں جہاد کا جوش و جذبہ پیدا ہوا مگر ہندوستان میں شرعی قواعد کی رو سے اس کا موقع صحیح طور پر میسّر نہ آسکتا تھا اس لئے آپ نے اول لوگوں کو جہاد کی ترغیب دلائی اور زبان و تحریر سے یہ مسئلہ اس موثر طریقے سے بیان کیا کہ لوگ گروہ در گروہ اپنے گھر بار چھوڑ کر آپ کے ہمراہ جانے کے لئے بخوشی تیار ہو گئے"۔

"دمیکہ جمعیت بہم رسید ازیں دیار ہجرت نمودہ بحدود افغانستان پیوستند و قتال

و جدال را در دیار ہند کہ زیر حکومت دولت انگلشیہ بود جہاد ندیدند"۔ (16)

(جب ایک جماعت فراہم ہو گئی تو اس ملک (ہندوستان) سے ہجرت کر کے حدود افغانستان میں چلے گئے اور ملک ہندوستان میں جو انگریزی حکومت کے ماتحت تھا آپ جنگ و جدال کو جہاد نہیں سمجھتے تھے)۔ آگے چل کر نواب صاحب لکھتے ہیں کہ جب ہندوستان کے---- (17) نے دیکھا کہ سید صاحب افغانوں کے سرحدی حدود میں جہاد کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے آپؒ کو محمد بن عبدالوہاب نجدی کے دامن سے وابستہ قرار دے دیا اور آپؒ کے خلاف ناروا باتیں کہیں۔ حالانکہ حاشا وکلا آپؒ کو محمد بن عبدالوہاب نجدی سے ظاہری یا باطنی کوئی بھی تعلق نہیں۔ نواب صاحب فرماتے ہیں:۔

"جہاد نہ ایجاد شیخ نجد بود بلکہ ایں مسلہ در جملہ کتب اسلام از کتاب و سنت و فقہ و خبر آں مرقوم است اما تا شروط و قیود آں موجود نگردد روا نیست و لہٰذا سید احمد در ہند جہاد نہ کرد و با دولت برطانیہ طرف نشد ہجرت نمود بیرون ازیں معمولہ میدانی صف با سکھاں و افغاناں آراست"_____ (18)

(جہاد کوئی شیخ نجد کی ایجاد نہیں بلکہ یہ مسئلہ تو کتاب و سنت اور فقہ کی تمام اسلامی کتب میں لکھا ہوا موجود ہے۔ البتہ جب تک اس جہاد کے لئے اس کی شروط و قیود موجود نہ ہوں جہاد جائز نہیں۔ اس لئے سید احمد صاحب نے ہندوستان میں جہاد نہ کیا اور حکومت برطانیہ کے مدمقابل نہ ہوئے۔ اسے چھوڑ کر اس کی قلم رو سے باہر چلے گئے اور سکھوں اور افغانوں سے جا صف آرا ہوئے)

ہمارے خیال میں نواب صدیق حسن خاں کی ان واضح تحریروں پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ نواب صاحب کی مندرجہ بالا تحریر کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا جعفر تھانیسری کا وہ بیان پڑھئے جس میں انہوں نے سید صاحب سے یہ الفاظ منسوب کئے ہیں:۔

"کسی کا ملک چھین کر ہم بادشاہت کرنا نہیں چاہتے نہ انگریزوں کا ملک لینا ہمارا مقصد ہے---- ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گراویں"___ (19)

اس کے ساتھ مولانا غلام رسول مہر کی وہ روایت پڑھیئے جو موصوف نے سید صاحب سے منسوب کی ہے کہ آپؒ سے ہندوستان میں رہ کر جہاد کرنے کی درخواست کی گئی اور روپیہ' اسلحہ اور افرادی قوت کی پیش کش کی گئی مگر آپ نے فرمایا:۔

"مجھ کو منظور نہ ہوا' اس لئے کہ جہاد موافق سنت چاہیئے بلوا کرنا منظور نہیں"۔ (20)

کیا ان تینوں تحریروں سے ایک ہی مفہوم ظاہر نہیں ہوتا اور کیا نواب صدیق حسن خاں مرحوم کی اس رائے کی تائید نہیں ہوتی کہ سید صاحب انگریزی حکومت سے جنگ کرنے کو از روئے شرع جہاد نہیں سمجھتے تھے۔ اسے بلوا قرار دیتے تھے۔ ان کے خیال میں انگریزوں سے جنگ کرنا اصول مذہب کے خلاف یا بلا سبب طرفین کا خون بہانا تھا کیونکہ انگریزوں سے جنگ کرنے کے لئے جن قیود و شروط کی ضرورت تھی وہ ہندوستان میں موجود نہ تھیں۔

اب اگر کوئی کہتا ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف جہاد کرنے کی تمام شرائط موجود تھیں اور سید صاحب کا جہاد تھا بھی انگریزوں کے خلاف مگر نواب صدیق حسن خاں' علمائے اہل تشیع' علمائے دیوبند اور علمائے اہل حدیث نے اپنی اپنی جماعتوں کو بچانے کے لئے اور نواب صاحب نے اپنا اقتدار محفوظ رکھنے کے لئے یہ فتوے دیئے تو اس سے ثابت ہو گا کہ یہ سب علماء پرلے درجے کے بزدل' منافق اور بے ایمان تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے قرآن و حدیث پر بھی ہاتھ صاف کر دیا اور اسلامی تعلیمات کو بدل ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کیا ایسا سوچا بھی جا سکتا ہے؟ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ علماء دو کوڑی کے نہیں رہتے ہم تو ان کے بارے میں اس قسم کی بدظنی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کا نظریہ

اب آخر میں ایک ایسے عالم کی رائے سید احمد شہید کے رخ جہاد کے بارے میں پیش کی جاتی ہے جو اعلیٰ درجے کا محقق و سیرت نگار ہونے کے علاوہ سید احمد صاحب

کا دلی عقیدتمند اور دیوبندی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ ہماری مراد مولانا مناظر احسن گیلانی سے ہے۔ مولانا نہ سرکار دربار سے وابستہ تھے نہ کسی ریاست کے حاکم تھے نہ سرکار کے خطاب یافتہ تھے نہ ان کا سیاست سے کوئی واسطہ تھا۔ بزرگان دیوبند اور اس تحریک کے مستند تذکرہ نگار تھے' مولانا فرماتے ہیں:۔

"اسی زمانے میں آخر سید شہید' مولانا شہید اور ان کے راستباز مخلص رفقا کی جاں بازیوں کو دیکھتے ہوئے پھر کلیت کا دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ ان بزرگوں کی جدوجہد کا رخ بھی بجائے انگریز اور انگریزی حکومت کے پنجاب کی سکھ طاقت ہی کی طرف اول سے آخر تک جو پھرا رہا"۔ (21)

اس واضح تحریر کے بعد کیا اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ باقی رہ گیا کہ مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے مفکر' مورخ اور محقق بھی اسی نتیجے پر پہنچے کہ سید احمد شہید' شاہ اسماعیل شہید اور ان کے راستباز رفقا کے جہاد کا رخ بھی انگریزوں کی بجائے اول سے آخر تک پنجاب کی سکھ طاقت کی طرف رہا۔

یہی موقف سر سید احمد خاں کا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد کی باتیں کرنا مسلمانوں کو تباہ کرانے کے مترادف ہے۔ اسی لئے انہوں نے انگریزوں کی حمایت کی اور ان سے جہاد کو درست قرار نہ دیا کیونکہ ان سے پہلے ان کے اکابر (سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید) نے بھی انگریزوں سے جہاد کو بلا شبہ خوں ریزی قرار دیا تھا۔

حواشی:

1_ سوانح احمدی صفحہ 71 مولفہ مولوی جعفر تھانیسری_ صوفی پرنٹنگ اور پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ پنڈی بہاء الدین

2_ دی انڈین مسلمانز صفحہ 5 تا 7 مصنفہ ولیم ولسن ہنٹر مطبوعہ کامریڈ پریس۔ کلکتہ۔ ہنٹر نے سید صاحب کے پشاور پہنچنے اور اعلان جہاد کی انگریزی تاریخیں صحیح نہیں لکھیں۔ (پیام)

3_ "دی پٹھانز" صفحہ 301' مولفہ اولف کیرو۔ مطبوعہ لندن 1962ء

4_ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ 141 مولفہ مولانا مسعود عالم ندوی- مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدر آباد دکن

5_ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک صفحہ 143

6_ تواریخ عجیبہ صفحہ 52__ 51 مرتبہ پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری

7_ تواریخ عجیبہ صفحہ 62 تا صفحہ 64 مولفہ مولانا جعفر تھانیسری

8_ سوانح احمدی صفحہ 110 تا صفحہ 111

9_ سوانح احمدی صفحہ 71

10_ سید احمد شہید صفحہ 277 مولفہ مولانا غلام رسول مہر

11_ مکتوبات احمدی صفحہ 180 صوفی پرنٹنگ پریس پنڈی بہاء الدین

12_ یہاں نواب صاحب مرحوم نے ایک مخالف عالم کا نام درج کیا ہے اور انہیں سید صاحب کا دشمن قرار دیا ہے- چونکہ مولف اس کتاب کو فرقہ واریت سے پاک رکھنا چاہتا ہے اس لئے یہ سطر حذف کردی گئی ہے-(پیام)

13_ ترجمان وہابیہ صفحہ 65 و صفحہ 66 مولفہ نواب صدیق حسن خاں مطبع مفید عام آگرہ-1300ھ

14_ ترجمان وہابیہ صفحہ 80

15_ تقصار جنود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص 109، مولفہ نواب صدیق حسن خاں طبع فی المطبع الشاہجہانی، بھوپال 1289ھ

16_ تقصار جنود الاحرار صفحہ 109-

17_ یہاں بھی ایک مخصوص فرقہ کا ذکر کیا گیا ہے اس لئے یہ الفاظ حذف کر دیئے گئے ہیں-(پیام)

18_ تقصار جنود الاحرار صفحہ 110-

19_ سوانح احمدی صفحہ 71

20_ سید احمد شہید صفحہ 277

21_ سوانح قاسمی صفحہ 94 مولفہ مولانا مناظر احسن گیلانی شائع کردہ مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور-

سرسید کی قومی غیرت

1857ء کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد ہر طرف مرگ آسا سکوت طاری تھا- ہندو بغاوت کا الزام مسلمانوں کے سر ڈال کر الگ ہو گئے تھے، انگریزوں کو یقین دلا دیا گیا تھا کہ یہ بغاوت مسلمانوں نے کی یہ لوگ بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ بنا کر اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینا چاہتے تھے- انگریز مسلمانوں سے خوفناک انتقام لے رہے تھے- شہر، قصبات اور دیہات ان کے خون سے لالہ زار بن رہے تھے- ان کی عصمت مآب عورتوں سے کنویں بھرے ہوئے تھے- درختوں کی شاخوں پر ان کے معزز سرداروں کی لاشیں جھول رہی تھیں- ان کی جائیدادیں کوڑیوں کے مول نیلام کی جا رہی تھیں اور بولی دینے والے ہندو تھے- اس ہنگامہ دار و گیر میں ہر شخص چپ سادھے بیٹھا تھا- آج سرسید پر کفر کے فتوے لگانے اور انہیں غدار وطن قرار دینے والوں کے اکابر ہر قسم کی جرات سے عاری تھے- اس نازک موقع پر اگر کوئی شخص مرد میداں بن کر کھڑا ہوا تو وہ یہی سرسید احمد خاں تھا- اس نے انگریزوں کو بڑی جرات سے ٹوکا کہ تم غلط کہتے ہو اس بغاوت کی ذمہ داری تمہاری غلط روش پر بھی عائد ہوتی ہے-تم نے اپنی بے تدبیری سے ایسے حالات پیدا کئے کہ لوگ غلط فہمی کا شکار ہو کر تمہاری حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے، چنانچہ اس مقصد کے لئے سرسید احمد خاں نے ایک رسالہ تحریر کیا جو" رسالہ اسباب بغاوت ہند" کے نام سے مشہور ہوا- ذیل میں اس رسالے کے بعض اقتباسات درج کئے جاتے ہیں-

اسباب بغاوت کی جرات مندانہ نشاندہی

(1) اصل سبب اس فساد کا تو میں ایک ہی سمجھتا ہوں، باقی جس قدر اسباب

ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔ سب لوگ تسلیم کرتے چلے آئے ہیں کہ گورنمنٹ کی خوبی اور پائیداری کے لئے ضروری ہے کہ امور حکومت میں رعایا کو بھی شریک کیا جائے۔ خصوصاً" ہماری گورنمنٹ کے لئے تو یہ بہت ضروری تھا کیونکہ وہ ایک غیر ملک کی رہنے والی ہے اور یہاں کے لوگوں کے مذہب اور رسم و رواج سے پوری طرح واقف نہیں۔ پس ضروری تھا کہ لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستان کے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا۔ یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی۔

(2) ہندوستان کے لوگ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ یہاں کے لوگوں کے مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے اور سب کو 'کیا ہندو اور کیا مسلمان' عیسائی مذہب اور اپنے ملک کی رسم و رواج پر لاڈالے۔ سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ اعلانیہ مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرے گی بلکہ خفیہ تدبیریں مثلاً نوکریوں کا لالچ' پادریوں کے ذریعے وعظ اور اپنے دین کی کتابوں کی اشاعت کے ذریعے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کرے گی۔

(3) پادری لوگ ایسا لٹریچر پھیلا رہے تھے جن میں دوسرے مذاہب کے بارے میں رنج دہ مضامین درج ہوتے تھے۔ بعض ضلعوں میں تھانے کا ایک چپراسی بھی پادری صاحب کے ساتھ ہوتا تھا اور پادری اپنے وعظ میں دوسرے مذاہب کے مقدس لوگوں کا ذکر برائی اور ہتک سے کرتے تھے۔

(4) مشنری اسکولوں میں بچوں کے لئے نہ صرف عیسائی مذہب کی تعلیم لازمی تھی بلکہ جو طالب علم سوالات کے جوابات مذہب عیسوی کے مطابق دیتا تھا' اسے انعام ملتا تھا۔ گو سرکار نے کسی کو ان اسکولوں میں داخل ہونے پر مجبور نہیں کیا تھا لیکن ہندوستان کے لوگ مفلسی سے نجات پانے کے لئے اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کرتے تھے کہ ان کی اولاد کو کچھ وجہ معیشت اور روزگار حاصل ہو گا۔

(5) سرکار نے بہت سے ہندوستانیوں کی اراضی ضبط کرلی تھی جس کے نتیجے میں ان میں ناراضگی اور بے چینی پھیل گئی اور انہوں نے خیال کیا کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش کی نہیں ہم سے وہ جائیداد بھی چھین لی جو اگلے بادشاہوں نے ہمیں دی

تھی۔ سرکار کے اس اقدام نے تنگی معاش کے ہاتھوں ہندوستان کے لوگوں کو سخت مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔

(6) سرکار نے بندوبست مال گزاری کا جو قانون نافذ کیا اس میں قابل تعریف باتوں کے ساتھ ساتھ بعض خرابیاں بھی تھیں اور ایسی زمینوں پر بھی محصول لگ گیا جو بغیر کاشت پڑی ہوئی تھیں۔ مال گزاری ادا کرنے کے لئے زمینداروں کو سود لینا پڑتا تھا اس کو ادا کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ رفتہ رفتہ بہت سے زمیندار مفلس ہو گئے۔

(7) اسٹامپ کے اجراء سے اہل ہند کی طبائع پر خراب اثر پڑا۔ یہ خالص ولایتی قانون تھا۔ ہندوستان کے عقلمند لوگوں نے اسے ناپسند کیا۔ ہندوستان کی رعایا جو پہلے ہی مفلس ہوتی چلی جارہی تھی وہ ہرگز یہ زیرباری اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

(8) اگلے عہد میں صوبوں کے حاکموں' سرداروں اور امیروں سے ہزاروں لاکھوں شرفا بہ طور سوار وابستہ تھے۔ اس طرح ان کا روزگار قائم تھا مگر ہماری سرکار نے ان حاکموں اور سرداروں کی ریاستیں لے کر ان بکثرت لوگوں کو جن کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی بے روزگار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب باغیوں نے لوگوں کو نوکر رکھنا چاہا ہزاروں آدمی نوکری کے لئے جمع ہو گئے جیسے بھوکا آدمی قحط کے دنوں میں اناج پر گرتا ہے اسی طرح یہ لوگ نوکریوں پر جاگرے۔ بہت سے آدمی صرف ڈیڑھ آنہ یومیہ پر (باغیوں کے) نوکر ہوئے تھے اور بہت سے آدمی ڈیڑھ سیر یومیہ اناج پاتے تھے۔

(9) اگلی عملداریوں میں بادشاہ وقتاً" فوقتاً" رعایا کو زمینیں اور نقد رقوم بطور انعام دیا کرتے تھے اس طرح ان کی مدد معاش ہوتی رہتی تھی۔ یہ بات ہماری گورنمنٹ میں یک قلم مسدود تھی۔ پہلی جاگیریں بھی ضبط ہو گئی تھیں۔ ولایت کی اشیاء آنے سے ہندوستان کے ہنرپیشہ لوگوں کا روزگار تباہ ہو گیا تھا یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ کپڑا بنانے والوں کا کاروبار تو بالکل ختم ہو کر رہ گیا تھا۔

(10) اہل ہند علی الخصوص مسلمانوں کی ناراضگی کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ان پر ترقی کے دروازے بند تھے۔ انہیں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مقرر نہیں کیا جاتا تھا

جبکہ ماضی میں انہیں حکومت کے معزز عہدے حاصل تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اب بھی ان کی ویسی ہی عزت اور قدر و منزلت ہو۔

(11) جو سبب اس مقام پر ہم لکھتے ہیں گو وہ ہمارے بعض حکام کے ناگوار طبع ہو مگر ہم کو سچ کہنا اور دل کھول کر لکھنا ضرور ہے۔ رعایا ہندوستان کی اس بات کی بہت شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقر کر دیا ہے۔ کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہلکار، صاحب کے سامنے مسل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے کہ صاحب کی بد مزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔ یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گزرتی تھیں کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں باعزت چلے آتے ہیں ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے۔

(12) ہندوستانی فوج کو بے انتہا غرور تھا فوج انگلشیہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا قول تھا کہ برہما سے لے کر کابل تک ہم نے سرکار کو فتح کر کے دیا ہے۔ پنجاب کی فتح کے بعد ہندوستانی فوج کا غرور بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ ایسے وقت میں جبکہ ان کے سر غرور سے بھرے ہوئے تھے ان کو نئے کارتوس دیئے گئے جس میں وہ یقین کرتے تھے کہ چربی کا میل ہے اور اس کے استعمال سے ہمارا دھرم جاتا رہے گا۔ انہوں نے یہ کارتوس دانتوں سے کاٹنے سے انکار کیا۔ میرٹھ میں سپاہ کو اس جرم میں جو سزا دی گئی وہ بہت سخت تھی جس کو ہر ایک عقلمند بہت برا اور ناپسند جانتا تھا۔ اس سزا کا رنج جو کچھ فوج کے دل پر گزرا بیان سے باہر ہے۔ وہ اپنے تمغوں کو یاد کرتے تھے اور بجائے اس کے بیڑیوں اور ہتھکڑیوں کو پہنے ہوئے دیکھتے تھے۔ وہ اپنی وفاداریوں کا خیال کرتے تھے اور پھر اس کے صلے میں جو ان کو انعام ملا تھا اسے دیکھتے تھے۔ پھر سب فوج میرٹھ کو یقین ہو گیا کہ ہم کو کارتوس (دانتوں سے) کاٹنا پڑے گا یا یہی دن نصیب ہو گا۔ اس رنج اور غصہ کی حالت میں دسویں مئی کو فوج سے وہ حرکت سرزد ہوئی کہ شاید اس کی نظیر بھی کسی تاریخ میں نہیں ملے گی۔۔۔ اس حرکت کے بغیر فوج کو کیا چارہ تھا کہ جہاں تک ہو

سکے فساد برپا کرے۔ میں بہت معتبرات کہتا ہوں کہ دلی میں جو باغی فوج جمع تھی اس میں ہزاروں آدمیوں کو اس بے جا حرکت اور بے فائدہ بغاوت کا رنج تھا مگر وہ سمجھتے تھے کہ اب سرکار کا ہم پر سے اعتماد اٹھ گیا ہے اور ہم پر قابو پانے کی صورت میں ہم کو تباہ کر دے گی پس وہ مجبور تھے کہ فساد پر کمر باندھ لیں۔ (1) (ملخص)

اہل ہند کا بے خوف وکیل

اس سے بحث نہیں کہ سرسید احمد خاں نے بغاوت کے جو اسباب بیان کئے ان میں کتنے درست ہیں اور کتنے محل نظر یا کچھ اور اسباب بھی ہیں جو سید مرحوم کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے۔ دیکھنے اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے وقت جب مسلمانوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا اور ان کے اکابر پر خاص طور سے انگریزوں کی کڑی نظر تھی سرسید احمد خاں نے بڑی دلیری، جرات اور صاف گوئی سے کام لے کر اس بغاوت کی ساری ذمہ داری انگریزوں پر ڈال دی۔ انہوں نے بڑی بہادری اور قابلیت سے اہل ہندوستان کا مقدمہ لڑا۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ فرقہ وارانہ جذبات و خیالات سے بالاتر ہو کر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی یکساں وکالت کی۔ انگریزوں کو بے تدبیر قرار دیا، پادریوں کی متعصبانہ روش پر کھل کر تنقید کی، اراضیوں کی ضبطی پر انگریزوں کو مورد الزام قرار دیا، امور حکومت میں اہل ہند کی عدم شرکت کو بغاوت کی اصل اور بنیاد ٹھہرایا۔ سرسید نے نشاندہی کی کہ سرکار نے تمام اہم عہدوں پر انگریزوں کو مقرر کر کے اہل ہند کی حق تلفی کی اور اپنی اس غیر دانشمندانہ روش سے انہیں ناراض کیا۔ انہوں نے انگریزوں کو بتایا کہ مسلمانوں کا معاملہ ہندوستان کی دوسری اقوام سے مختلف ہے یہ طبعاً "ایک غیرت دار قوم ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ عظیم محسن اور شیر دل وکیل میرٹھ کے ان باغی فوجیوں کی مدافعت کے لئے بھی بے خوف و خطر کھڑا ہو گیا جو انگریزوں کے نزدیک اصل مجرم تھے اور جن کی وکالت کرنا خود کو مصیبت میں مبتلا کرنا تھا۔ سرسید نے کارتوسوں کے استعمال سے انکار کرنے کے جرم میں میرٹھ کے باغی سپاہیوں کو پابہ زنجیر کرنے کے خالص فوجی فیصلہ پر کھل کر تنقید کی اور اسے غیر دانشمندانہ قرار دے کر

کہا کہ ان باغیوں کے پاس سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار ہی نہ رہ گیا تھا کہ فساد پر کمر بستہ ہو جائیں۔

ہمیں بتایا جائے کہ بغاوت کے فوراً بعد پورے ہندوستان میں کوئی ایک شخص بھی اس قسم کی جرات کر سکا؟ آج اس واقعے کے قریباً ڈیڑھ سو سال کے بعد سرسید کو انگریزوں کا خوشامدی قرار دینے والے لوگ اپنے اکابر میں سے کسی ایک شخص کی نشاندہی کریں جس نے اس جرات اور حق گوئی سے نہ صرف اہل ہند کی صفائی پیش کی ہو بلکہ میرٹھ کے باغیوں کے اس خطرناک اور فوجی جرم کے لئے جواز مہیا کیا ہو۔ مارشل لاء کے قانون پر کھل کر تنقید کرنا اور فوجی عدالت کے فیصلے کو اس وقت غلط اور بے تدبیری کا فیصلہ قرار دینا جب انگریزوں کے ظلم و ستم سے بڑے بڑے حریت پسند مہر بہ لب تھے، بڑے دل گردے کا کام تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی کی شرافت نفس، نیکی و پارسائی اور راست بازی پر آج تک کسی شخص نے حرف گیری نہیں کی۔ مولانا حالی نے سرسید کی سوانح عمری میں یہ واقعہ درج کیا ہے کہ سرسید نے یہ رسالہ 1857ء کی بغاوت فرو ہونے کے بعد لکھنا شروع کر دیا اور آگرہ کے مطبع میں چھپنے کے لئے بھیج دیا۔ 1859ء میں اس کی پانسو (500) جلدیں چھپ کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔ جب سرسید نے ان کو (برطانوی) پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور ماسٹر رام چندر کے چھوٹے بھائی رائے شنکر داس جو اس وقت مراد آباد میں منصف (مجسٹریٹ) اور سرسید کے نہایت دوست تھے انہوں نے کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان کو معرض خطر میں نہ ڈالو۔ سرسید نے کہا "میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیر خواہی سمجھتا ہوں۔ پس ایسے کام میں جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لئے مفید ہو مجھ کو کچھ گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے۔ رائے شنکر داس نے جب سرسید کی آمادگی بہ درجہ غایت دیکھی اور ان کے سمجھانے کا کچھ اثر نہ ہوا تو وہ آبدیدہ ہو کر خاموش ہو رہے۔ سرسید نے اول دو رکعتیں بہ طور نوافل ادا کئے اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانسو جلدوں کا ایک پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد

گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور چند جلدیں اپنے پاس رکھ لیں"۔(2)

سرسید کے خلاف "مل بیڈن" کا غیظ و غضب

سرسید کے اس رسالے پر انگلستان کی پارلیمنٹ میں طویل بحث ہوئی۔ بہت سے اراکین ایوان نے اسے پسند کیا اور سرسید کی رائے سے اتفاق کیا مگر اس کے ساتھ ساتھ اس رسالے کی شدید مخالفت بھی کی گئی۔ چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "گورنمنٹ انڈیا میں جب یہ کتاب پہنچی اور انگریزی ترجمہ ہو کر کونسل میں پیش ہوئی تو----- مسٹر بیڈن نے جو اس وقت فارن سیکرٹری تھے اس کے خلاف بہت بڑی اسپیچ دی اور یہ رائے ظاہر کی کہ "اس شخص نے نہایت باغیانہ مضمون لکھا ہے اس سے حسب ضابطہ باز پرس ہونی چاہیے اور جواب لینا چاہیے اور اگر کوئی معقول جواب نہ دے سکے تو سخت سزا دینی چاہیے"۔(3)

گویا سرسید احمد خاں کے دوستوں کی رائے غلط نہ تھی اور سرسید نے یہ رسالہ لکھ کر آگ سے کھیلنے کی کوشش کی تھی۔ مگر انہوں نے ملک و قوم کے لئے ہر خطرہ مول لیا۔ سرسید کی تنہا یہی خدمت انہیں قوم کا محسن ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ سرسید نے خود کو خطرے میں ڈال کر جو قدم اٹھایا تھا اس کے خاطر خواہ نتائج نکلے اور ملک و قوم کو اس سے دوررس فوائد پہنچے۔ چنانچہ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ "سرسید کی بہت سی تجویزوں کے مطابق عمل درآمد ہوا اور اکثر شکایتوں کا تدارک کیا گیا۔ مثلاً

(1) سرسید کے مطالبے پر 1861ء میں یعنی اس رسالے کے برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہونے کے ایک سال بعد لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستان کے لوگوں کو شامل کیا گیا۔

(2) ہائی کورٹ کی ججی پر 1862ء میں پہلی بار ایک انڈین مقرر ہوا (یہ سرسید کے بیٹے نہیں تھے) اس طرح اعلیٰ عہدوں پر اہل ہند کے تقرر کا دروازہ کھل گیا۔

(3) 1861ء میں سرسید کی یہ تجویز قبول کرلی گئی کہ "لیجس لیٹو کونسل میں ہندوستانی ممبروں کو نامزدگی کی بجائے انتخابات کے ذریعہ مقرر کیا جائے"۔ گویا یہ لوکل

سیلف گورنمنٹ کا بنیادی پتھر تھا۔

مختصر یہ کہ سرسید احمد خاں نے 1857ء کی بغاوت میں انگریزوں کی حمایت کر کے ملک و قوم کو تباہی سے بچا لیا اور انہیں خصوصاً مسلمانوں کو زندگی کے آبرومندانہ راستے پر گامزن کر دیا۔ انہوں نے مسلمانوں میں انگریزی اور سائنسی علوم حاصل کرنے کا شوق پیدا کرنے کے لئے جو کوششیں کیں حتی کہ اپنی صحت اور عزت تک داؤ پر لگا دی یہ ان کی اتنی بڑی خدمت ہے کہ برصغیر کے مسلمان قیامت تک ان کے احسان مند رہیں گے ورنہ آج مسلمان گھاس کھود رہے ہوتے یا ہندوؤں اور سکھوں کے بوٹ پالش کر رہے ہوتے۔ یہ انگریز کے اسی "خوشامدی" اور "ٹوڈی" کا صدقہ ہے کہ ہندوستان سے لے کر پاکستان تک علوم جدیدہ کے ماہرین کی ایک فوج ظفر موج نظر آتی ہے جو بڑے بڑے ترقی یافتہ ممالک سے خراج تحسین حاصل کر رہی ہے۔ اگر سرسید میدان عمل میں نہ آتے تو انہیں انگریزوں کا ایجنٹ کہنے والے آج "پی ایچ ڈی" ہونے کی بجائے کسی مسجد کے لئے روٹیاں جمع کر رہے ہوتے۔

سرسید احمد خاں کی ملکی و قومی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے۔ یہاں صرف چند جھلکیاں دکھانا مقصود تھا۔ اس موضوع پر اعلیٰ درجے کے لٹریچر کا انبار لگا ہوا ہے۔ جس کے مطالعے سے سرسید احمد خاں کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

حواشی:

1_ "اسباب بغاوت ہند" مشمولہ حیات جاوید شائع کردہ ادبی دنیا اکادمی لاہور۔

2_ حیات جاوید صفحہ 61 مولفہ الطاف حسین حالی۔ مطبع مسلم یونیورسٹی انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ۔ طبع سوم۔

3_ حیات جاوید صفحہ 62

جہاد کی حقیقت؟

جہاد کسی کے ملک پر چڑھ دوڑنے کا نام نہیں نہ سیاسی جنگوں کو جہاد مقدس کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح توسیع سلطنت کی پست خواہش کو جہاد کہنا اس مقدس اصطلاح کی توہین ہے۔ جہاد نام ہے اللہ کے راستے میں جدوجہد اور سعی و کوشش کرنے کا۔ ضروری نہیں کہ یہ جدوجہد مسلح ہی ہو۔ ایک جہاد سے واپس آنے والے غازیوں سے حضورؐ اقدس نے ارشاد فرمایا تھا کہ "**قد متم خیر مقدم من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر**" (اب تم جہاد اصغر (چھوٹا جہاد) سے جہاد اکبر (بڑا جہاد) کی طرف واپس آ گئے ہو)۔ (تفہیم القرآن جلد سوم ص 254، تفسیر سورۃ الحج از مولانا ابوالاعلیٰ مودودی)

یعنی تلوار سے جہاد تو چند روز یا چند ماہ جاری رہتا ہے اس لئے حضورؐ اقدس نے اسے جہاد اصغر (چھوٹا جہاد) قرار دیا مگر اپنے نفس سے جہاد، اپنی پست خواہشات کے خلاف جہاد، برائیوں کے خلاف جہاد تو ہر لمحہ اور ساری عمر جاری رہتا ہے اور اس میں تلوار کے جہاد کے مقابلے میں کہیں زیادہ قربانیاں دینی پڑتی ہیں اس لئے حضورؐ اقدس نے اسے جہاد اکبر قرار دیا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مسلح جدوجہد ترک کر دینی چاہئے، مسلح جدوجہد تو قومی بقا کے لئے انتہائی ضروری ہے لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ ہر مسلح جدوجہد کو جہاد مقدس نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک خاص اصطلاح ہے۔ یہ قرآن شریف کا حکم ہے جس کا انکار کفر ہے۔ جہاد اکبر کی طرح یہ جہاد کبھی منسوخ نہیں ہو سکتا لیکن اس جہاد کی کچھ شرائط ہیں جب تک وہ شرائط موجود نہ ہوں اس وقت تک جہاد نہیں ہو سکتا۔ اس سلسلے میں حضور اقدسؐ کا اسوہ مبارک ہمارے لئے مشعل راہ اور منارہ ہدایت کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ کون سا ظلم تھا جو اہل مکہ نے حضور ؐ اقدس پر روا نہیں رکھا۔ طائف میں آپ پر کیسے کیسے ستم توڑے گئے' آپ ؐ سے دشمنوں کے لئے بددعا کرنے کو کہا گیا مگر آپ ؐ نے ان کے لئے دعا کی۔ اپنے دست اقدس سے کسی بدترین دشمن کو جوابی طور پر بھی ایذا نہیں دی۔ حضور ؐ اقدس جسمانی طور پر غیر معمولی طاقتور اور توانا تھے۔ جب ابو جہل نے آپ ؐ کے رخسار مبارک پر طمانچہ مارا تو اس کے جواب میں آپ ؐ اس کے گال پر ایسا تھپڑ رسید کر سکتے تھے کہ اس کا منہ گھوم جاتا مگر آپ ؐ نے غیر معمولی صبر سے کام لیا' انتقام نہیں لیا بلکہ تاریخ کہتی ہے کہ آپ ؐ کے چچا سید الشہدا حضرت حمزہ ؓ بن **عبدالمطلب** نے جب آپ ؐ کی شان میں ابو جہل کی طرف سے گستاخی کی خبر سنی تو اسی وقت اس کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور خانہ کعبہ میں اسے جا لیا اور اس کے سر پر اپنی وزنی کمان دے ماری۔ اسے لہولہان کر کے حضور ؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "اے میرے بھتیجے! خوش ہو جاؤ کہ میں نے ابو جہل سے تمہارا انتقام لے لیا"۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ یہ سن کر آپ ؐ نے فرمایا کہ "اے میرے چچا! میں انتقام لینے سے خوش نہیں ہوا کرتا۔ میں تو اس وقت خوش ہوں گا جب آپ اسلام قبول کر لیں گے" اور دوسرے لمحے حضرت حمزہ ؓ کی زبان پر کلمہ شہادت جاری تھا۔

ذرا تصور کیجئے کہ احد کا میدان ہے دشمن کا لشکر رسول ؐ اقدس اور آپ ؐ کے نام لیواؤں کے نام تک بزعم خود مٹا دینے کے درپے ہے' تیروں کی بارش ہو رہی ہے' حضور ؐ اقدس زخمی ہو جاتے ہیں' دندان مبارک شہید ہو جاتے ہیں' دہن مبارک سے خون بہہ رہا ہے مگر چہرہ انور پر دور دور تک غیظ و غضب کے آثار نہیں' لبوں پر نعرہ انتقام نہیں' ہاں! زبان مبارک پر کچھ الفاظ ضرور جاری ہیں مگر.....! آپ کو معلوم ہے وہ الفاظ کیا ہیں! سنئے: **"اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون"** (اے اللہ میری قوم کو معاف کر دے کیونکہ یہ لوگ جانتے نہیں (کہ یہ کیا کر رہے ہیں اور کس کے ساتھ کر رہے ہیں) (1)

گویا اپنے خونخوار دشمنوں کا بھی دکھ میں پڑنا آپ ؐ کو طبعاً گراں گزرتا تھا' ایذا

دہی کو آپ ؐ سخت ناپسند فرماتے تھے' آپ ؐ کے مزاج کا جھکاؤ عفو و درگزر کی طرف تھا۔ ذیل کے تاریخ ساز واقعے سے حضور ؐ اقدس کے طرز فکر اور افتاد طبع کا ایک عجیب دل کش و دل نشیں پہلو سامنے آتا ہے۔

صحابہ کا جہاد پر اصرار

جو لوگ حضور ؐ اقدس پر ایمان لائے تھے وہ بھی آخر عرب تھے' قریش تھے' غیرت و حمیت کے پیکر اور شجاعت و صلابت کے متحرک مجسّمے' دشمنوں کے مظالم پر مسلسل خاموشی ان کے مزاج کے خلاف تھی۔ آخر ان میں سے چند لوگ مکہ کے ایک نامور سردار حضرت عبدالرحمٰن ؓ بن عوف کی معیت میں حضور ؐ اقدس کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ "اے اللہ کے رسول ؐ! جب ہم مشرک تھے تو عزت والے تھے اور کسی کی جرات نہ تھی کہ ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھ سکے لیکن مسلمان ہو کر ہم ضعیف و ناتواں ہو گئے ہیں اور دشمن کے ہاتھوں ذلیل ہو رہے ہیں' اس کے ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔ اے اللہ کے رسول ؐ! اجازت دیجئے کہ میدان میں اتر کر ہم ان کا مقابلہ کریں"۔

آپ کو معلوم ہے کہ غیرت و حمیت کے ان پیکروں کو..... ہاں! اللہ اور اس کے رسول ؐ کے ان فدائیوں کو..... حضور ؐ اقدس نے کیا جواب دیا؟ آپ نے فرمایا **"انی امرت بالعفو فلا تقاتلوا"** (**مجھے** عفو و درگزر سے کام لینے کا حکم ہے اس لئے میں تمہیں (دشمن سے) جنگ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا)۔(2)

حضور ؐ اقدس کے یہ الفاظ بتا رہے ہیں کہ آپ ؐ کا ہر قدم اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق اٹھتا تھا' آپ ؐ کی زندگی کا ہر لمحہ' آپ ؐ کا کھانا پینا' اٹھنا بیٹھنا' سونا جاگنا' دوستی اور دشمنی صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لئے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ ؐ کے سر بکف اور جاں باز عقیدت مند آپ ؐ سے جنگ کی اجازت مانگتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ ہم اپنی قوم کے معزز لوگ ہیں' ماضی میں کوئی ہماری طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا اسلام قبول کرنے کے بعد ہماری عزت اور شجاعت میں کوئی کمی نہیں

ہوئی، ہماری ہمتیں پست نہیں ہوئیں، ہم وہی سر بکف اور سرباز لوگ ہیں۔ اے اللہ کے مقدس رسولؐ! آپؐ ہمیں اجازت دیجئے تاکہ ہم ان دشمنان اسلام کے سروں سے فرعونیت کا سودا نکال دیں.... مگر اپنے سرفروش عقیدت مندوں کو آمادہ جنگ پا کر بھی آپؐ انہیں جنگ کی اجازت نہیں دیتے حالانکہ آپؐ خود دشمنوں کے ہاتھوں سخت اذیت ناک زندگی گزار رہے تھے لیکن اس کے باوجود آپؐ جوش میں نہیں آتے اور فرماتے ہیں کہ "ہرگز نہیں، مجھے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ عفوودرگزر کا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پھر میں تمہیں جنگ کی اجازت کیسے دوں؟

قرآن کریم کی شہادت:۔

خود قرآن کریم بھی اس حدیث مبارک کی تائید کرتا ہے جس کی رو سے بعض جوشیلے اور جنگجو مسلمان دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کے لئے بے تاب تھے اور مدینہ جا کر ان کا جذبہ جہاد اور بھی مشتعل ہو گیا تھا چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

الم تر الی الذین قیل لھم کفوا ایدیکم الخ (النسا-77)

"(اے رسول) کیا آپ کو ان لوگوں کے بارے میں معلوم نہیں جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو جنگ سے روکے رکھو"۔

یعنی مسلمانوں کے دلوں میں دینی غیرت کی وجہ سے دشمنان اسلام سے جنگ کرنے کا جذبہ بھڑک اٹھا تھا مگر اللہ تعالیٰ نے حضورؐ اقدس کے ذریعے سے انہیں روک دیا تھا کہ ابھی جنگ کا وقت نہیں آیا اس لئے صبر سے کام لو اور انتظار کرو۔

دوسرے مقام پر فرمایا:۔

ویقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ الخ (سورہ محمد-20)

"(جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ کہتے ہیں کہ (رسول کریمؐ پر) کوئی ایسی سورت کیوں نازل نہیں ہوتی جس میں جنگ کا حکم دیا گیا ہو۔)"

گویا یہاں بھی بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان بزدل نہیں تھے، جنگ سے خائف نہیں

تھے بلکہ ان کے دلوں میں کفار سے جنگ آزما ہونے کا جذبہ جوش زن رہتا تھا اور بار بار تڑپ پیدا ہوتی تھی کہ کاش انہیں دشمنان اسلام سے نبرد آزما ہونے کی اجازت مل جائے مگر اس کے باوجود حضورؐ اقدس انہیں جنگ سے روک رہے تھے۔

اندازہ فرمائیے کہ مکہ میں مسلمانوں پر کیسے کیسے لرزہ خیز مظالم کئے گئے، انہیں تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر اور سینے پر پتھر کی گرم سلیں رکھ کر اذیتیں دی گئیں۔ پیروں میں رسیاں باندھ کر گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ حضرت سمیہؓ جیسی جلیل القدر صحابیہ کو نیزہ مار کر شہید کر دیا گیا۔ یہ سارے ظلم آپؐ کی آنکھوں کے سامنے مسلمانوں پر ڈھائے گئے مگر آپؐ نے اعلان جہاد نہیں فرمایا کیونکہ طاقت نہیں تھی، حالات سازگار نہیں تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آسمان سے جنگجو فرشتوں کے لشکر اتار دیتا اور آن واحد میں دشمنان اسلام کو ملیا میٹ کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا کہ یہ قانون قدرت کے خلاف تھا۔

جب کفار مکہ کے مظالم حد سے تجاوز کر گئے تو آپؐ نے مسلمانوں کو ہجرت کر جانے کا حکم تو دیا مگر مکہ میں بے مقصد خوں ریزی کرنے اور مسلمانوں کی جانیں ضائع کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ہاں جب حضورؐ ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے، وہاں کے مسلمانوں، عیسائیوں، یہودیوں اور بت پرستوں سے معاہدے کئے، جنگ و جہاد کے لئے ماحول کو سازگار بنایا اور پوری تیاری کر لی پھر دشمن سے نبرد آزما ہوئے۔ نتیجہ یہ کہ فتح و کامرانی نے حضورؐ اقدس کے قدم چومے۔ اس فتح و کامرانی نے آئندہ بے شمار فتوحات اور کامرانیوں کے دروازے کھول دیئے۔ گویا دنیا کے سب سے عظیم سپہ سالارؐ نے ہمیں بتایا اور سمجھایا کہ جہاد آنکھیں بند کر کے دشمن سے ٹکرا جانے کا نام نہیں، یہ شجاعت نہیں حماقت ہے نہ ضد اور اپنی بات پر اڑ جانے کا نام جہاد ہے، نہ ذاتی اور گروہی مفادات کے لئے جنگ کرنے کا نام جہاد ہے، نہ اپنی انا کو مسئلہ بنا لینے کا نام جہاد ہے۔ یہ سب پست جذبات و احساسات ہیں ان کا جہاد سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاد کب فرض ہوتا ہے

قرآن شریف ہمیں بتاتا ہے کہ جہاد کب فرض ہوتا ہے؟ سنیئے! اور غور

فرمائیے! ارشاد ہوتا ہے:-

ومالکم لاتقاتلون فی سبیل اللہ الخ (سورہ النساء آیت نمبر75)

(تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان کمزوروں کی خاطر جنگ نہ کرو جن میں کچھ مرد' کچھ عورتیں اور کچھ بچے ہیں جو دعا کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں اور ہمارے لئے اپنی جناب سے کسی دوست کو کھڑا کردے اور کسی مددگار کو بھیج دے)۔

ممتاز عالم دین مولانا اشرف علی تھانوی نے اپنے ترجمہ قرآن میں اس آیت کریمہ کے حاشیے پر یہ نوٹ دیا ہے:-

"شہر (مکہ) میں ایسے لوگ بہت سے تھے کہ حضرتؐ کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے اور ان کے (کافر) اقربا ان پر ظلم کرنے لگے کہ (وہ) مسلمان سے پھر کافر ہو جائیں"۔

قرآن کریم کی اس آیت کریمہ نے ثابت کر دیا کہ جب مسلمانوں کے دینی معاملات میں مداخلت کی جائے' انہیں اپنا مذہب ترک کر کے کفر کی طرف لوٹ جانے پر مجبور کیا جائے اور اس بنا پر انہیں سختیوں اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جائے تو ان کی امداد مسلمانوں پر فرض ہو جاتی ہے اس کا نام جہاد ہے۔

آگے چل کر قرآن حکیم مسئلہ جہاد کی ایک بار پھر وضاحت فرماتا ہے' چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:-

اب ان لوگوں کو بھی لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے جن پر بہت ظلم کیا گیا اور:-

ن الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الخ (سورہ الحج آیت 40)

(جنہیں صرف اتنا کہنے پر کہ اللہ ہمارا رب ہے بلا وجہ اپنے گھروں سے نکالا گیا)۔

یہاں بھی مسلمانوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت اس صورت میں دی گئی ہے کہ انہیں اور ان کے بھائیوں کو صرف اس جرم میں ان کے گھروں سے نکالا گیا کہ وہ

خدائے واحد کے پرستار تھے' بتوں سے نفرت کرتے تھے اور ان کی عبادت کو اپنے اوپر حرام کر چکے تھے۔ گویا یہ کوئی سیاسی جنگ نہیں تھی' کسی دوسرے ملک پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لینے کا عسکری منصوبہ نہیں تھا بلکہ خالص دینی مقاصد کے لئے جنگ کی جا رہی تھی۔ اگر مکہ کے کفار مسلمانوں پر ظلم نہ کرتے' انہیں ان کے دین سے منحرف ہو کر مرتد ہو جانے پر مجبور نہ کرتے تو ان کے خلاف جنگ کا حکم کبھی نہ دیا جاتا۔

ہمیں بتایا جائے کہ انگریزوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی کس بستی کے لوگوں کو دین سے منحرف ہونے پر مجبور کیا؟ اپنا مذہب ترک کر کے مذہب عیسوی اختیار کرنے کی غرض سے ان پر ظلم کیا؟ کیا انہیں جبراً" عیسائی بنایا؟ جواب نفی میں ہے پھر ان کے خلاف جہاد کیسے فرض ہو گیا۔

سکھوں کے خلاف جہاد کیوں نہیں ہوا؟

جہاد تو اس وقت فرض ہوا تھا جب سکھ مسلمانوں پر ظلم کر رہے تھے' انہیں اذانیں دینے سے روک رہے تھے' ان کی مساجد کو اصطبل بنا رہے تھے' انہیں جبراً" سکھ بنا رہے تھے' ان کی پاکباز عورتوں کی آبروریزی کر رہے تھے۔ اس وقت تو ہم ان کے قدموں میں ڈھیر ہو گئے اور ان کے خلاف جہاد کا نام تک نہ لیا بلکہ ان کی نوکریاں کیں ان سے عہدے قبول کئے۔ اس وقت ہماری دینی غیرت کہاں چلی گئی تھی؟ عجیب بات ہے کہ جب انگریزوں نے سکھوں پر حملہ کر کے ان کی ظالمانہ حکومت کا خاتمہ کیا' مسلمانوں کو ان کے ظلم سے نجات دلائی' ان کی مساجد واگزار کروائیں' انہیں مذہبی آزادی عطا کی' ان کی عزت و آبرو کی حفاظت کی تو ان کے خلاف جہاد کا نعرہ لگایا گیا؟ بتائیے ہے کوئی معقولیت اس اقدام میں؟

عورتوں اور بچوں کو قتل کرنا جہاد نہیں

یہ حقیقت بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسلام کے نقطہ نگاہ سے سول آبادیوں پر حملے کرنے کا نام جہاد نہیں' نہتے لوگوں کو نشانہ بنانے کا نام جہاد نہیں'

اپنے ملک میں مقیم غیر مسلم افراد پر حملے کرنے کا نام جہاد نہیں، غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو خون سے رنگنے کا نام جہاد نہیں، غیر مسلم عورتوں اور بچوں کو قتل کرنے کا نام جہاد نہیں۔ یہ سب پست، گھٹیا اور خلاف اسلام حرکات ہیں جن کی اسلام تو کیا دنیا کا کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ معاشرہ بھی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن تو خالص دینی مقاصد کے لئے جنگ (جہاد) کرنے والوں پر بھی پابندی عائد کرتا ہے اور فرماتا ہے کہ:-

ولا یجر منکم شنان قوم علی الا تعد لو! اعد لو! الخ (سورہ المائدہ آیت 8)

(یعنی اے مسلمانو! کسی قوم کی دشمنی میں اس حد تک نہ بڑھ جاؤ کہ تم اس کے ساتھ بے انصافی کرنے لگو (نہیں) انصاف کرو کہ انصاف تقویٰ سے زیادہ قریب ہے)۔

ہم نے 1857ء کے نام نہاد جہاد میں کیا کیا؟ دلی میں مقیم انگریزوں کی عورتوں اور معصوم بچوں کا قتل عام کیا، گرجا گھر کے اردگرد واقع مسیحیوں کے مکانوں کو لوٹ کر آگ لگا دی۔ کانپور میں مقیم انگریز عورتیں اور بچے جب ایک معاہدے کے تحت کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کے راستے الہ آباد روانہ ہونے لگے تو باغی فوجوں نے دریا کے دونوں طرف سے بندوقوں کی باڑھیں مار کر انہیں خون میں نہلا کر دریا میں غرق کر دیا۔ یہ ہم نے عہد کی "پاسداری" کی؟ جبکہ قرآن کا حکم ہے **"او فوا بالعھد"** اپنے عہدوں کو پورا کرو۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حرکت مرہٹہ سردار نانا صاحب کی تھی مگر کیا باغی مسلمان افسر اس میں شامل نہیں تھے؟ کیا یہ جہاد تھا؟ اسی کو جہاد کہتے ہیں؟ ہمارے اسلاف نے کیا اس طرح جہاد کیا تھا؟

بعض لوگ ان مظالم کا ذکر بہت جذباتی انداز سے کرتے ہیں جو انگریزوں نے 1857ء کی بغاوت کے اختتام کے بعد دہلی اور دوسرے شہروں کے مسلمانوں پر روا رکھے۔ پھانسی کے پھندے، گولیاں، بے گناہوں کا قتل عام، آگ، خون اور بربادی کے ساتھ یہ "جہاد" اپنے انجام کو پہنچا۔ اس غم و الم میں ہم پوری طرح ان کے ساتھ ہیں۔ یقیناً یہ بہت بڑا ظلم تھا اور تاریخ ظالموں کو ہرگز معاف نہیں کرے گی مگر

ایک بات ہم ان لوگوں سے پوچھنا چاہتے ہیں جو 1857ء کی سرکشی اور فساد کو جہاد قرار دینے میں معقولیت کی ساری حدوں کو توڑ دیتے ہیں کہ۔

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر! کس بھروسے پہ آشنائی کی؟

جب باغی فوجوں کے پاس نہ وسائل تھے، نہ طاقت تھی، نہ مضبوط قیادت تھی، تنظیم کا قابل شرم حد تک فقدان تھا، پھر مقابلہ دنیا کی سب سے بڑی طاقت اور منظم ترین حکومت سے تھا جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا تو کس نے کہا تھا کہ آپ جہاد کریں۔ کیا طبیب نے نسخے میں لکھا تھا؟ جہاد کی شرائط اور وسائل ناپید ہونے کی حالت میں جہاد کرنے کا جو نتیجہ ہونا چاہیئے تھا وہی ہوا۔ ظالم خود بھی برباد ہوئے اور ہزاروں لاکھوں اہل وطن کو بھی برباد کیا، بستیوں کی بستیاں اجڑوا دیں۔ خدا اور اس کے رسول ؐ کا نام لے کر میدان جہاد میں اترنے والوں کا آج تک کبھی ایسا عبرتناک حشر ہوا؟ ہرگز نہیں۔ ان کی نصرت کے لئے تو آسمان سے فرشتے نازل ہوتے ہیں اور فوج در فوج نازل ہوتے ہیں۔ اگر انہیں کبھی پسپائی اختیار بھی کرنا پڑتی ہے تو وہ عارضی اور وقتی ہوتی ہے اور حق جلد ہی غالب آ جاتا ہے مگر یہاں کیا ہوا؟ ناکامی، نامرادی، بربادی، رسوائی، مسلمان عورتوں کی بڑے پیمانے پر آبروریزی۔ کیا یہ ثمرات ہوتے ہیں جہاد کے؟ خدا کے بندو! عقل سے کام لو، لفاظی اور جذباتی باتوں سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا نہ لفاظی حقائق آشنا لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ حقائق کی دنیا میں آؤ اور قرآن شریف کا یہ ارشاد یاد رکھو کہ:

ولن یجعل اللہ الکافرین علی المومنین سبیلا O (النساء آیت 161)

(اور اللہ کافروں کو مومنوں پر ہرگز غلبہ عطا نہیں کرتا)

پس اگر یہ جہادی مومن ہوتے اور اللہ کی خوشنودی اور دین کی سربلندی کے لئے میدان جہاد میں نکلتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ شرائط جہاد کے مطابق نکلتے تو کبھی شکست نہ کھاتے نہ سکھ ان پر غالب آتے اور نہ انگریز غالب آتے۔ یاد رکھئے یہ خدا کا فیصلہ ہے اور ہمیشہ کے لئے ہے اس میں نہ وقت کی قید ہے نہ مقام کی یہ آج بھی اسی طرح نافذ العمل ہے جس طرح ماضی میں تھا۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر کوئی غیر مسلم طاقت مسلمانوں کے کسی ملک پر حملہ کردے تو اس ملک کے مسلمان اور ان کی حکومت دشمن کا مقابلہ نہ کریں اور اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیں ہرگز ایسا نہیں یہ تو بے غیرتی اور پرلے درجے کی بے حمیتی ہے جو کسی طور گوارا نہیں کی جاسکتی۔ اس صورت میں مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا پوری پامردی سے مقابلہ کریں اور اپنی جانیں قربان کردیں مگر جب انہیں شکست ہو جائے اور مزید مقابلہ کرنے کی طاقت باقی نہ رہے تو دو ہی صورتیں ہیں یا تو کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جائیں یا اس شرط پر فاتح کے زیر سایہ زندگی گزارنے پر آمادہ ہو جائیں کہ ان کی جانوں' اموال' عزت و آبرو کی حفاظت کی جائے گی' ان کے دینی امور میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی جائے گی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں سے شکست کھا جانے کے بعد یہی دوسرا راستہ اختیار کیا جو عقلمندی کا راستہ تھا۔ اس کے سوائے ان کے لئے اور کوئی راستہ باقی ہی نہیں رہا تھا۔

حواشی:

1- "شفا" مولفہ حضرت قاضی ابوالفضل عیاض" بن موسیٰ ص 41، نسخہ حیدر آباد دکن۔

2- "السنن الکبریٰ" مولفہ امام بیہقی"۔ جلد نمبر9، صفحہ نمبر17- مطبوعہ بیروت طبع جدید 1994ء-

سر اقبال کا جہاد

کچھ مدت قبل ہفت روزہ "تقاضے" لاہور میں دو مراسلے شائع ہوئے تھے ان میں سرسید احمد خاں پر تنقید کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا گیا کہ انہوں نے تو قوم کو انگریز کی دائمی غلامی پر آمادہ کرلیا تھا وہ تو بھلا ہو علامہ اقبال کا جنہوں نے انگریز کے خلاف علم جہاد بلند کر کے سرسید کی غلامانہ کوششوں پر پانی پھیر دیا' ان کا قلع قمع کر دیا۔ (ہفت روزہ "تقاضے" 15 جنوری 2001ء)

آیئے دیکھیں کہ اس دعوے میں کہاں تک صداقت ہے؟ اور اقبال نے انگریز کے خلاف کون سا جہاد کیا؟ جہاں تک اقبال کی شاعرانہ عظمت کا تعلق ہے اس کا اعتراف نہ کرنا پرلے درجے کی جہالت ہے یا انتہا درجے کا تعصب۔ اقبال اپنی صدی کا بہت بڑا شاعر تھا اس نے اردو شاعری کو نیا لہجہ دیا' نیا اسلوب دیا' نئے نئے موضوعات دیئے۔ اس نے ایک خفتہ بخت قوم کو اپنے حیات پرور نغموں سے بیدار کرنے کی قابل قدر کوشش کی۔ یقیناً یہ بھی ایک جہاد تھا مگر قلمی و فکری جہاد لیکن اقبال نے انگریز کے خلاف رزم آرائی کا درس نہیں دیا بلکہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کی تلقین کی اور خود بھی ساری زندگی انگریز کی اطاعت کی اور اس سے تعاون و اظہار وفاداری کو اپنا نصب العین بنائے رکھا۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا انکار کرنا بھی پرلے درجے کی جہالت ہے۔ اب اس حقیقت کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

یہ 1910ء کا ذکر ہے کہ مصر میں مسلمان اکابر کی ایک کانفرنس منعقد کرنے کا منصوبہ زیر غور تھا۔ "انجمن اسلامیہ ہزارہ" کے سیکرٹری علی گوہر صاحب نے برصغیر کے مسلمان اکابر سے دریافت کیا کہ اس کانفرنس میں ہندوستان کے مسلمانوں کا شریک ہونا

کیا مناسب ہو گا؟ یہ استفسار لاہور کے مشہور اخبار "پیسہ اخبار" کے ذریعے کیا گیا تھا۔
اقبال کا شمار اس وقت بھی برصغیر کے ممتاز مسلمان مفکرین میں ہوتا تھا اس لئے انہوں نے بھی اس موضوع پر اظہار خیال کیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ہندوستان کے مسلمان شاید اسلامی ممالک کی حالت کا اندازہ صحیح طور پر نہیں لگا سکتے کیونکہ حکومت برطانیہ کے سبب جو امن اور آزادی اس ملک کے لوگوں کو حاصل ہے اور ممالک کو ابھی نصیب نہیں ہے"۔

آگے چل کر کہتے ہیں کہ ____ "مسلمانان عالم کے کسی ملک میں کوئی ایسی تحریک عام طور پر نہیں ہے جس کا منشا یورپ سے پولیٹیکل مقابلہ کرنا ہو نہ ایسا خیال ایک ایسی قوم میں پیدا ہو سکتا ہے"۔

پھر لکھا کہ "مسلمانوں کو کلام الٰہی میں امن و صلح کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تلقین کی گئی ہے"۔

آپ کا نیاز مند

محمد اقبال بیرسٹرایٹ لاء، لاہور

("پیسہ اخبار" لاہور 22 اگست 1910ء)

کیا اقبال کی اس تحریر کے کسی ایک لفظ سے بھی انگریز کے خلاف جہاد کرنے کا اشارہ تک ملتا ہے؟ بلکہ موصوف تو برصغیر کے مسلمانوں کو واضح ترین الفاظ میں مشورہ دے رہے ہیں کہ تمہیں تاج برطانیہ کے زیر سایہ جو امن و امان حاصل ہے، دوسرے ممالک میں اس کا وجود تک نہیں اس لئے اس کی قدر کرو کیونکہ مسلمانوں کو تو قرآن شریف میں حکم دیا گیا ہے کہ امن و اماں سے زندگی بسر کرو اور حاکم وقت سے صلح رکھو۔ اقبال نے قرآن کریم کی ایک آیت شریفہ کا حوالہ دے کر فرمایا کہ مسلمانوں کو تو (حکومت کے خلاف) سرکشی اور نافرمانی کے کاموں میں خفیہ مشورہ کرنے تک کی ممانعت کی گئی ہے۔

فرمائیے! کیا اسی کو جہاد کہتے ہیں؟ یہ تو درس اطاعت ہے یہی درس سرسید نے دیا تھا تو وہ کشتنی اور گردن زدنی ٹھہرا؟

تاج دار برطانیہ کا نوحہ

یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے کہ اقبال انگریزی حکومت سے تعاون اور اس سے وفاداری کا اظہار رسمی طور پر نہیں کرتے تھے نہ اس میں تصنع اور بناوٹ کو دخل تھا نہ اس سے کوئی ذاتی مفاد حاصل کرنا مقصود تھا بلکہ یہ ان کا نظریہ اور عقیدہ تھا کہ ایسی حکومت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہوتی ہے جس کے زیر سایہ لوگ امن و امان سے زندگی گزارتے ہوں، اس کی قدر کی جانی چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حکومت برطانیہ کی سربراہ ملکہ وکٹوریہ کا (1901ء میں) انتقال ہوا تو اقبال نے نہایت پرسوز اور طویل نظم لکھی جو سو سے بھی زیادہ اشعار پر مشتمل تھی جس کا ایک ایک لفظ گواہی دیتا ہے کہ اس میں تکلف اور بناوٹ سے ہرگز کام نہیں لیا گیا ہے بلکہ یہ ایک زخمی دل کی آواز ہے جو اپنی اور اپنی قوم کی محسنہ کی جدائی پر دل پردرد سے نکلی ہے۔ اتفاق کی بات کہ جس روز ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا اسی روز مسلمانوں کی عید تھی۔ اس مناسبت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اقبال نے اپنے دردمندانہ جذبات کا اس طرح اظہار کیا کہ۔

آئی ادھر نشاط، ادھر غم بھی آ گیا
کل عید تھی تو آج محرم بھی آ گیا

(سرود رفتہ ص 183)

(مرتبہ: غلام رسول مہر، صادق علی دلاوری شائع کردہ: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، لاہور)

اسلامی کیلنڈر کے مطابق پہلے عید آتی ہے پھر محرم آتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہاں بھی اسی طرح ہوا کہ کل مسلمانوں کا روز عید تھا اور آج ہمیں محرم کا دن دیکھنا پڑا۔ گویا ملکہ وکٹوریہ کی وفات کا غم محرم کی طرح اپنے جلو میں غم والم لے کر آیا ہے۔ آگے چل کر کہتے ہیں کہ اس عید کی کیا خوشی جس سے اتنا بڑا سانحہ وابستہ ہو کہ ہماری سرتاج، ہماری ملکہ عالیہ ہم سے جدا ہو گئی۔

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے، ہوا کرے
اس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

(سرود رفتہ ص 185)

سوز و درد میں ڈوبے ہوئے اس شعر کا اس کے سوائے کیا اور کوئی مفہوم ہو سکتا ہے کہ کاش یہ عید نہ آئی ہوتی' اس سے کہیں بہتر تھا کہ موت آجاتی تاکہ ہمیں یہ روز بد تو دیکھنا نصیب نہ ہوتا؟

پھر مزید فرمایا کہ۔

وکٹوریا نہ مرد کہ نام نکو گذاشت
ہے زندگی یہی جسے پروردگار دے

(سرود رفتہ ص 191)

یعنی ملکہ وکٹوریہ کو مردہ نہ کہو' وہ زندہ ہے کیونکہ اپنے پیچھے اپنے کردار' اپنے اخلاق' اپنے طرز جہاں بانی و طرز جہانگیری اور رعایا پروری کی ایسی یادیں چھوڑ گئی ہے جو اس کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ فرماتے ہیں زندگی تو یہی ہے جو ملکہ معظمہ (وکٹوریہ) کو نصیب ہوئی۔ اسے اقبال اللہ تعالیٰ کی دین (عطا) قرار دے رہے ہیں کہ لوگ مرنے کے ساتھ ہی مرجاتے ہیں مگر ملکہ عالیہ مرنے کے بعد بھی زندہ ہے اور تاقیامت زندہ رہے گی۔ (وکٹوریا نہ مرد)

ملکہ وکٹوریہ "ظل اللہ" تھی

زمانہ قدیم میں مسلمان اپنے بادشاہ کو "ظل اللہ" کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے یعنی اللہ کا سایہ لیکن "اللہ کا سایہ" ان حکمرانوں کو کہا جاتا تھا جو کلمہ گو اور مسلمان ہوتے تھے۔ شاید وجہ اس کی یہ تھی کہ اسلامی عقیدے کی رو سے بلکہ قرآن شریف کے ارشاد کے مطابق سلطنت و حکومت اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے چنانچہ فرمایا:۔

"وہ جس سے چاہتا ہے حکومت و اقتدار لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے سلطنت و حکومت عطا فرمادیتا ہے"۔ (آل عمران آیت 26)

اس ارشاد خداوندی سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ چونکہ بادشاہ اللہ تعالیٰ کا مقرر کردہ ہوتا ہے' اس کا نائب ہوتا ہے اس لئے اسے ظل اللہ یعنی اللہ کا سایہ کہا جاتا تھا مگر اقبال شاید اسلامیان ہند میں سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے جرات رندانہ سے کام لے کر اس خالص اسلامی اصطلاح کو وسعت دے کر غیر مسلم حکمرانوں کو بھی اس میں شامل

کرلیا چنانچہ ملکہ وکٹوریہ کے انتقال پر اسے خراج تحسین و عقیدت ادا کرتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ۔

اے ہند تیرے سر سے اٹھا "سایۂ خدا"
اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی' گئی

(سرود رفتہ ص 187)

اپنے اس تعزیتی شعر میں اقبال ملکہ وکٹوریہ کو خدا کا سایہ قرار دے رہے ہیں اسی کو عربی میں "ظل اللہ" کہتے ہیں اور یہ اصطلاح مسلمان خلفاء اور سلاطین کے لئے استعمال کی جاتی تھی مگر اقبال نے اسے کافرہ حکمران کے لئے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ یہ اپنی امن پرور ملکہ سے ان کے اظہار عقیدت کا ایک انداز تھا جس پر حرف گیری نہیں کی جاسکتی کیونکہ خود بقول اقبال اسے قرآنی سند بھی حاصل تھی۔

اقبال کو سرکار انگریزی سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار ایک آدھ مرتبہ نہیں بلکہ بار بار ہوا چنانچہ 1911ء میں شہنشاہ برطانیہ ملک معظم کی تاج پوشی کی رسم ادا کی گئی۔ اس موقع پر لاہور میں ایک تہنیتی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہ تقریب سعید کہاں برپا کی گئی؟ اس کے لئے خانہ خدا کا انتخاب کیا گیا یعنی لاہور کی بادشاہی مسجد میں اس وقت کے علمائے کرام اور مسلمانوں کے اکابر قوم جمع ہوئے اور ایک غیر مسلم بادشاہ سے اپنی عقیدت و فرماں برداری کا اظہار کیا۔ ان عقیدت مندان سرکار میں حضرت اقبال بھی شامل تھے۔ موصوف نے اس موقع پر مسلمانوں کو ایک بار پھر سرکار برطانیہ کی اطاعت و فرماں برداری کا اس پردے میں درس دیا کہ:۔

"مسلمانوں کا آئیڈیل سلطنت نہیں بلکہ اپنے دین کو زیادہ سے زیادہ پھیلانا ہے اور حکومت انگریزی میں اس کی اجازت ہے"۔

("پیسہ اخبار" 24 جون 1911ء)

یہی موقف سرسید کا تھا کہ جس حکومت کے زیر سایہ مسلمانوں کو امن حاصل ہو اور وہ اپنی زندگی اپنے مذہبی احکام کے مطابق گزارنے میں آزاد ہوں' جہاں وہ تبلیغ

اسلام کا فریضہ بلا روک ٹوک انجام دے سکتے ہوں وہاں جہاد جائز نہیں۔ یہی اقبال فرما رہے ہیں بلکہ انہوں نے تو یہاں تک فرمادیا کہ مسلمانوں کا مقصد حیات اور نصب العین سیاست و حکومت ہے ہی نہیں۔ اقبال چونکہ بنیادی طور پر شاعر تھے اور شاعر اپنے احساسات و افکار کو نظم کے پیرائے میں بیان کئے بغیر رہ سکتا ہی نہیں چنانچہ موصوف نے ملک معظم کی تاجپوشی کے موقع پر ہدیہ نظم بھی اپنے بادشاہ کے حضور پیش کیا۔ ملاحظہ ہو کس عقیدت سے فرماتے ہیں۔

ہمائے اوج سعادت ہے آشکار اپنا
کہ تاجپوش ہوا آج تاجدار اپنا
اسی سے عہد وفا ہندیوں نے باندھا ہے
اسی کی خاک قدم پر ہے دل نثار اپنا

شاید سرسید انگریزوں سے اپنی تمام تر وفاداری اور عقیدت مندی کے باوجود اس حد تک آگے نہیں جا سکے جس حد تک اقبال جا پہنچے کہ "شاہ برطانیہ" کے قدموں سے جو خاک اڑتی ہے اس پر بھی میرا دل نثار ہو"۔

شاہ برطانیہ کی خدمت میں اقبال کے سر کا نذرانہ

آگے چلئے، پہلی جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی، برطانوی فوجیں بغداد میں داخل ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیل رہی تھیں۔ عین انہی ایام میں لاہور کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ (1918ء میں) منعقد ہوا۔ صدارت گورنر پنجاب سر مائیکل اڈوائر نے کی۔ جلسے کا مقصد پنجاب سے لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے پر آمادہ کرنا تھا تاکہ وہ مصر، فلسطین اور عراق جا کر اپنے مسلمان بھائیوں پر گولیاں چلائیں۔ اس موقع پر اقبال نے اپنے منظوم کلام کے ذریعے پنجاب کے لوگوں کو برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کی نہایت پرزور تحریک فرمائی۔ ایک بند ملاحظہ ہو، نظم کا عنوان ہے "پنجاب کا جواب"۔

اخلاص بے غرض ہے، صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے، اطاعت بھی بے غرض

عہد وفا و مہر و محبت بھی بے غرض
تخت شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض

(سرود رفتہ ص 57)

یعنی اقبال حکومت برطانیہ سے اہل ہند کے تعاون کو مشروط نہیں کر رہے بلکہ اس کی غیر مشروط اور پرخلوص اطاعت کا درس دے رہے ہیں۔ اس تعاون کا مقصد درہم و دینار حاصل کرنا نہیں بلکہ بے غرض ہو کر اپنی سرکار کی خدمت کرنا مقصود ہے۔ نظم کے پہلے بند میں اقبال نے شہنشاہ برطانیہ کو جو پرجوش و پراثر خراج تحسین پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے، اس کا عنوان ہے "پنجاب کا جواب"۔

اے تاجدار خطہ جنت نشان ہند
روشن تجلیوں سے تری خاوران ہند
محکم ترے قلم سے نظام جہان ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبان ہند

ایسے عالی شان، مدبر اور منظم بادشاہ کے خلاف سرتابی کا خیال بھی رعایا کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اقبال نے شاہ برطانیہ کی تصویر ہی اس انداز سے کھینچی ہے کہ اس کی اطاعت و فرماں برداری ہر ہندی کے لئے ضروری ہو جاتی ہے کیونکہ بقول اقبال شاہ برطانیہ کی ذات گرامی اہل ہند کی حفاظت کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے۔ اس بند کے آخر میں علامہ نے جو شعر لکھ دیا ہے وہ تو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کر دیتا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

(سرود رفتہ ص 55)

اپنی حکومت سے ایسی نیازمندی بلکہ جاں نثاری کی مثالیں بہت کم ملیں گی بلکہ اقبال نے تو حاکم وقت پر جاں نثاری کی آخری حد کو چھو لیا کہ میدان جنگ میں سرکار انگریزی کی کامیابی و فتح مندی کے لئے اپنا سر پیش کر دیا اور اسے بھی ایک حقیر نذرانہ

قرار دیا۔ یہ سر بھی تنہا اقبال کا نہیں بلکہ پنجاب کے غیور عوام کے سر ہیں۔ پھر عرض کر دیا جائے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب برطانوی فوجیں بغداد کو تاراج کر رہی تھیں اور خلافت عثمانیہ کو پامال کر کے اسلامی خلافت کا خاتمہ کرنے کے درپے تھیں۔

جوبلی فنڈ میں اقبال کا عطیہ

ایک اور موقع آیا جب مسلمانان ہند اور ان کے اکابر نے اپنے بادشاہ سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا۔ اس موقع پر اقبال نے بھی اپنا فرض منصبی ادا کیا۔ یہ 1935ء کا ذکر ہے جب شہنشاہ برطانیہ ملک معظم جارج پنجم کی سلور جوبلی منانے کا اعلان کیا گیا اور پنجاب کے گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے "سلور جوبلی فنڈ" قائم کرنے کے بعد اہل پنجاب سے اس فنڈ میں حصہ لینے کی اپیل کی تو صوبہ کے بڑے بڑے روسا و امراء نے دل کھول کر اس فنڈ میں چندہ دیا۔ ڈاکٹر اقبال بھی کسی سے پیچھے نہ رہے اور بادشاہ سلامت سے عقیدت و اظہار وفاداری کے طور پر مبلغ یک صد روپے چندہ اپنی جیب خاص سے سلور جوبلی فنڈ میں عطا فرما کر عنداللہ ماجور ہوئے۔ چنانچہ بادشاہ معظم کی سلور جوبلی فنڈ میں چندہ دینے والوں کی جو فہرست شائع ہوئی تھی، اس میں ڈاکٹر اقبال کا نام بھی درج ہے اور موصوف کے نام نامی و اسم گرامی کا نمبر 6 ہے۔ یہ فہرست کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی، نام تھا "چندہ دہندگان سلور جوبلی"۔ فیروز پرنٹنگ پریس 119 سرکلر روڈ لاہور نے شائع کی تھی۔ جس صفحے پر اقبال کا نام درج ہے اس کا صفحہ نمبر 664 ہے۔ فہرست کو ضلع وار مرتب کیا گیا ہے۔ اقبال کا نام "لاہور ڈویژن" کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

یہی نہیں کہ اقبال نے انگریز بادشاہوں کی اطاعت و فرماں برداری کا دم بھرا بلکہ انہوں نے اس سے نیچے اتر کر انگریز گورنروں تک کو خراج تحسین پیش کیا اور ان کی شان میں تعریفی قصیدے پڑھے چنانچہ 1902ء میں جب انجمن حمایت اسلام لاہور کا تین روزہ سترھواں سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس کی ایک نشست کی صدارت لیفٹیننٹ گورنر پنجاب سر میگورتھ ینگ نے کی۔ یہ 22 فروری 1902ء کے اجلاس کی دوسری نشست تھی، اس موقعے کے لئے اقبال نے بطور خاص ایک نظم تیار کی اور انجمن حمایت اسلام کے ریکارڈ کی رو سے اس نظم کو صاحب گورنر پنجاب نے بہت پسند کیا۔ ایک بند

ملاحظہ ہو۔

خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینت بزم
کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر
وہ کون زیب وہ تخت صوبہ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصر عدل کی تعمیر

("اقبال اور انجمن حمایت اسلام" ص 76 مولفہ محمد حنیف شاہد (ایم-اے) شائع کردہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور)

اقبال اس انگریز گورنر کو وہ گوہر تابدار قرار دے رہے ہیں جس نے شاہ انگلستان کے تاج و تخت کو عظمت بخشی ہے اور یہ شان اس لئے دوبالا ہوئی ہے کہ اس انگریز گورنر نے صوبہ پنجاب کو عدل و انصاف سے بھر دیا ہے جس سے باشندگان پنجاب فیض یاب ہو رہے ہیں۔

بتائیے ایسے عادل گورنر سے سرتابی و سرکشی کا خیال کون اپنے دل میں لا سکتا ہے؟ کوئی بدبخت ہی ہو گا۔

اقبال آخر وقت تک انگریز کے وفادار رہے

شاید کوئی کہے کہ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب اقبال کا سیاسی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا اور انہوں نے انگریزوں کے طریقہ کار اور ان کے عیارانہ انداز سیاست کا جائزہ نہیں لیا تھا لیکن اس کے بعد جب حقائق ان پر پوری طرح منکشف ہو گئے تو وہ اپنے موقف سے دست بردار ہو گئے اور خم ٹھونک کر ملک کے دیگر حریت پسند رہنماؤں کی طرح انگریزوں کے مدمقابل آ گئے۔ کاش ایسا ہوتا مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ یاد رہے کہ اقبال 1877ء میں پیدا ہوئے اور ملکہ وکٹوریہ کی وفات 1901ء میں ہوئی گویا ملکہ کی وفات کے وقت اقبال کی عمر 24 سال کی تھی۔ جب انہوں نے اسے "سایہ خدا" قرار دیا تھا اور ملکہ کی میت کے گزرنے والے راستے کا غبار بن جانے کی آرزو کی تھی۔

میت اٹھی ہے شاہ کی، تعظیم کے لئے
اقبال اُڑ کے خاک سر رہگذار ہو

(سرود رفتہ ص 183)

یہ اس زمانے کی بات ہے جب اقبال اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور تاریخ کے پروفیسر تھے۔ پروفیسر اور وہ بھی تاریخ اور فلسفہ کا، نابالغ اور بے شعور نہیں ہوتا اور نہ 24 سال کی عمر، کم عمری کی عمر ہوتی ہے۔ پس تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال نے ملکہ وکٹوریہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ایک انتہائی باشعور فلسفی اور تاریخ داں کی حیثیت سے لکھا جس کے سامنے تاریخ اور اقوام یورپ کی تاریخ کے سارے ابواب کھلے ہوئے تھے اور وہ خوب جانتا تھا کہ انگریزوں نے کس طرح ہندوستان پر قبضہ کیا اور اپنی حکومت قائم کی۔

1910ء میں جب اقبال نے مصر میں مسلمان اکابر کی کانفرنس میں شرکت کی مخالفت کی تھی اور مسلمانان ہند کو حکومت برطانیہ کے خلاف سرکشی سے روکا تھا اس وقت ان کی عمر 33 سال کی تھی۔ یہ ان کی زندگی کا وہ دور تھا جب موصوف یورپ میں اپنی زندگی کے تین قیمتی سال گزار کر واپس آچکے تھے گویا دنیا دیکھ لی تھی، خصوصاً برطانوی سلطنت کے انگریز اراکین اور انگریز قوم کی طرز بود وباش کا، انگریزی طرز سیاست کا بہت قریب سے جائزہ لے چکے تھے، اسلامی ممالک کے اندرونی حالات و واقعات سے بھی آگہی حاصل کر چکے تھے، اس کے باوجود ان کی یہ رائے تھی کہ اسلامی ممالک میں کوئی ملک ایسا نہیں جو انگریزوں یا دوسری یورپی اقوام کے ساتھ ٹکر لینے کی خواہش یا حوصلہ رکھتا ہو اس لئے ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی امن و آشتی کے ساتھ اپنی حکومت سے تعاون کرتے رہنا چاہئے۔ خیال رہے کہ 33 سال کی عمر کا آدمی نادان نہیں ہوتا۔

1918ء میں پہلی جنگ عظیم کے موقع پر ٹاؤن ہال لاہور میں جب انہوں نے گورنر پنجاب سرمائیکل اڈوائر کی موجودگی میں تاج دار برطانیہ کی خدمت میں اپنا "سر" پیش کیا تھا ع

"ہنگامۂ وغا میں مرا سر قبول ہو"

تو موصوف کی عمر مبارک 41 سال کی ہو چکی تھی جب انسان کے بال سفید ہونے لگتے ہیں۔ کیا اس عمر میں بھی ان کا سیاسی شعور بیدار نہیں ہوا تھا؟

1935ء میں جب اقبال نے انگریز بادشاہ سلامت کی جوبلی فنڈ میں اپنی جیب خاص سے ایک سو روپیہ چندہ عطا فرمایا تاکہ ان کا نام بھی نیازمندان سرکار کی فہرست میں شامل کرلیا جائے تو موصوف 58 سال کے ہو چکے تھے۔ کیا اس عمر میں بھی ان کا تاریخی شعور بیدار نہیں ہوا تھا؟ اور وہ انگریز کی طرز سیاست کو ابھی سمجھ نہیں سکے تھے؟ اس واقعے کے تین سال "بعد" یعنی 1938ء میں تو ان کا انتقال ہوگیا۔ کیا بچوں کی سی باتیں ہیں، جنہیں کوئی صحیح الدماغ شخص قبول نہیں کرسکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت وقت کی اطاعت اور اس سے اظہار وفاداری ڈاکٹر سر محمد اقبال کے ایمان کا جزو تھا۔ یہ ان کا مذہبی عقیدہ تھا جس پر وہ آخری وقت تک قائم رہے اور خود حکومت برطانیہ بھی انہیں اپنا وفادار سمجھتی تھی ورنہ انہیں "سر" کا خطاب کبھی نہ دیتی۔ کیا دنیا میں آج تک کسی حکومت نے بھی اپنے کسی باغی کو انعام واکرام اور خطابات سے نوازا؟ حکومتیں انعام و اکرام اور خطابات انہی لوگوں کو دیتی ہیں جن سے وہ خوش ہوتی ہیں، جن کی وفاداری پر انہیں کوئی شک و شبہ نہیں ہوتا اور بلاشبہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنے طرز عمل سے ثابت کردیا کہ وہ سرکار برطانیہ کے دل و جان سے وفادار تھے اور اس وفاداری پر انہیں فخر تھا۔ وہ منافق نہیں تھے بلکہ شمشیر برہنہ تھے جو ان کے دل میں ہوتا تھا وہی زبان پر۔ ان کا یہ مصرع ان کے کردار کا آئینہ ہے ع

میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

اقبال سنت پیغمبری پر عامل تھے

بات دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف سنجیدگی سے توجہ دینے کی کوشش ہی نہیں کی گئی۔ اقبال پیشہ ور سیاست دان نہیں تھے نہ انہیں "زندہ باد" اور "مردہ باد" کے جذباتی نعروں سے کوئی دلچسپی تھی، وہ تاریخ کے طالب علم تھے۔ قرآن و حدیث کو اپنا سرمایہ حیات سمجھتے تھے اور اس اعتبار سے اسلامیات کے بھی طالب علم تھے۔ انہوں نے نہ صرف اسلام بلکہ یہودیت اور مسیحیت کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ

اسلام بلکہ ہر مذہب حاکم وقت کی اطاعت کا حکم دیتا ہے خصوصاً" اس حاکم کی اطاعت کا جو دینی معاملات میں مداخلت نہ کرتا ہو اور جس کے زیر سایہ لوگ امن و امان سے زندگی گزارتے ہوں۔ ان کے سامنے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد موجود تھا کہ "جو قیصر کا ہے قیصر کو دو' جو خدا کا ہے خدا کو دو"۔ (انجیل مقدس "متی" باب 22' آیت 21)

نیز فرمایا:-

"میرا جوا اپنے اوپر اٹھالو اور مجھ سے سیکھو" (انجیل مقدس۔ "متی" باب نمبر 11 آیت نمبر29)

"میرا جوا اپنے اوپر اٹھالو" کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ میری اطاعت کرو۔ گویا حضرت مسیحؑ کی تعلیم یہ ہے کہ "میری اطاعت کرو۔ حاکم وقت (قیصر) کی اطاعت کرو اور خدا کی اطاعت کرو"۔ یہ حقیقت بھی مد نظر رہے کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو اس بادشاہ کی اطاعت و فرماں برداری کا حکم دے رہے ہیں جو آپؑ کا منکر' کافر اور بت پرست تھا اور فرما رہے ہیں ____ کہ "میری اطاعت کرو' اپنے (کافر) بادشاہ کی اطاعت کرو اور خدا کی اطاعت کرو"۔ چھ سو سال کے بعد نازل ہونے والے قرآن کریم میں بالکل یہی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی کہ ____ "اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکم" (النساء آیت 69) یعنی اللہ کی اطاعت کرو' اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔

حضرت مسیحؑ کے زمانے میں حاکم قیصر روم تھا جس کے زیر سایہ آپؑ زندگی گزار رہے تھے۔ اقبال کے زمانے میں قیصر برطانیہ حاکم تھا جس کے زیر سایہ اقبال زندگی گزار رہے تھے۔ جس طرح حضرت مسیحؑ نے آخر وقت تک قیصر کی فرماں برداری کی' اسی طرح اقبال نے بھی اپنے زمانے کے قیصر کی اطاعت کی بلکہ اس سے "سر" کا خطاب بھی وصول کیا جسے انہوں نے زندگی کے آخری لمحے تک اپنے نام کا لاحقہ بنائے رکھا۔ ایسا نہیں کیا کہ یہ خطاب انہوں نے یہ کہہ کر انگریز کے منہ پر دے مارا ہو کہ "تم نے میری قوم کو غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اور مجھے خطاب دے کر بہلاتے ہو' یہ لو اپنا خطاب

مجھے ایسے خطاب کی ہرگز ضرورت نہیں"۔ انہوں نے اس کفران نعمت سے اجتناب کیا اور حاکم وقت سے سرتابی کو ناپسندیدہ' برا اور سنت پیغمبری کے خلاف جانا۔

اقبال کے سامنے ایک اور بڑی روشن مثال تھی۔ یہ روشنی بھی انہیں قرآن شریف ہی نے عطا کی تھی۔ وہ مثال تھی سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی۔ قرآن کہتا ہے کہ جب فرعون مصر پر حضرت یوسفؑ کی بے گناہی اور پاک دامنی ظاہر ہو گئی اور اسے معلوم ہو گیا کہ زلیخا نے آپؑ کو گمراہ کرنے اور اپنی جنسی ہوس کا نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی مگر آپؑ ثابت قدم رہے تو اس نے آپؑ کو جیل خانے سے رہا کر کے اپنے دربار میں طلب کیا۔ آپؑ کے ساتھ بہت عزت و تکریم سے پیش آیا اور کہا کہ میں آپ کو کوئی عہدہ دینا چاہتا ہوں۔ حضرت یوسفؑ نے فرمایا کہ مجھے خزانوں پر مقرر کر دو' میں اس علم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں"۔ (سورہ یوسف' آیت نمبر55, 54)

یہ نہیں فرمایا کہ "تم کون ہوتے ہو مجھے عہدہ دینے والے' تمہاری حیثیت ہی کیا ہے۔ میں خدا کا پیغمبر ہوں۔ تمہارے عہدے کا محتاج نہیں' میں تمہاری ماتحتی قبول نہیں کر سکتا۔ اترو تخت سے اس پر میں بیٹھوں گا' نبی بادشاہوں کی اطاعت نہیں کرتا' نہ ان سے عہدے قبول کرتا ہے" ____ بلکہ آپؑ نے خود فرعون مصر کو اس کا عہدیدار بننے کی پیشکش کی۔

چنانچہ فرعون نے حضرت یوسفؑ کو خزانوں کا نگران اعلیٰ مقرر کر دیا۔ گویا آپؑ بادشاہ وقت (فرعون) کی طرف سے افسر خزانہ یا وزیر خزانہ تھے۔ اس نے آپؑ کو بہت سے اختیارات بھی عطا کئے تھے اور آپؑ جہاں چاہتے تھے اپنی مرضی سے جاتے اور ضروری اقدامات کرتے تھے۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے کہ "ہم نے یوسف کو حکومت میں سے بھی کچھ حصہ دے دیا تھا"۔ اس کے باوجود ایک بات تو ظاہر ہے کہ وزیر بادشاہ کا ماتحت ہوتا ہے اس پر حاکم تو نہیں ہوتا اور اس سے تنخواہ پاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی بادشاہ وقت کی اطاعت کی حالانکہ آپؑ کتنے جلیل القدر پیغمبر تھے اور قرآن شریف کی ایک طویل سورت آپؑ کے لئے وقف ہے۔

پس اقبال نے حاکم وقت کی اطاعت و فرماں برداری کر کے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ پیغمبروں کی سنت پر عمل کیا اس لئے ان پر کوئی الزام نہیں آتا نہ انہیں خوشامدی اور غرض پسند کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب جہالت اور تعصب کی باتیں ہیں بلکہ تنگ نظری کی بھی۔ اسی طرح سرسید احمد خان نے انگریز کی اطاعت کر کے کوئی جرم نہیں کیا' ان کے سامنے بھی قرآن تھا' حدیث تھی' انجیل تھی بلکہ وہ تو انجیل کے اسکالر تھے اور خوب جانتے تھے کہ دنیا کا کوئی مذہب معاشرے میں فتنہ و فساد برپا کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ قائم شدہ حکومت کے خلاف بغاوت اسلام میں تو بطور خاص جرم ہے' سوائے اس کے کہ حکومت دینی معاملات میں مداخلت کرے اور مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرائض ادا کرنے سے روک دے۔ پس یہ وجہ تھی کہ سرسید اور اقبال دونوں نے حکومت برطانیہ سے تعاون کرنے کو اپنا مذہبی فریضہ جانا جس طرح 1857ء کے ہنگامے میں برصغیر کے تمام مکاتب فکر کے علماء نے حکومت وقت کے خلاف بغاوت کو ناجائز بلکہ حرام قرار دیا۔

اقبال اور تصور پاکستان

ہفت روزہ "تقاضے" لاہور کے بعض مضمون نگاروں نے اقبال کو سرسید احمد خاں کے مقابلے میں لا کر ایک اور بحث کا دروازہ کھول دیا کہ اقبال نظریہ پاکستان کے خالق اول تھے۔ ہمارے خیال میں یہ صدی کا سب سے بڑا جھوٹ ہے اور باعث شرم بات یہ ہے کہ گذشتہ نصف صدی سے یہ جھوٹ مسلسل بولا جا رہا ہے اور اتنی کثرت سے بولا گیا ہے کہ یہ جھوٹ اب "سچ" بنتا دکھائی دے رہا ہے۔ افسوس کسی میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اصل حقائق کو منظر عام پر لا سکے۔ بلاشبہ اقبال قوم کے لئے درد رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے شعری افکار اور اپنے بصیرت افروز خطبات سے قوم کے تن مردہ میں روح تازہ پھونکنے کی قابل قدر کوشش کی۔ ان کی یہ وہ خدمات جلیلہ ہیں جن کی قدر کی جانی چاہئے اور بلاشبہ قدر کی بھی گئی مگر اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کسی شخص کی دستار میں وہ گوہر بھی ٹانک دیں جو اس کا حصہ نہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال نے مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم اور مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مملکت کا نظریہ پیش کیا تھا مگر یہ نظریہ ان کا اپنا نہیں تھا وہ تنہا اس کے خالق نہیں تھے' یہ نظریہ بہت پہلے سے موجود تھا اور سب سے پہلے مصلح قوم سرسید احمد خاں نے اگرچہ غیر واضح طور پر ہی سہی لیکن اس جانب یہ کہہ کر 1867ء میں اشارہ کر دیا تھا کہ:

"اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی"۔ (حیات جاوید ص 94 مولفہ مولانا الطاف حسین حالی)

یعنی دونوں کے راستے جداگانہ ہوں گے اور ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں

گے۔

تصور پاکستان کا خالق اول ____ مولانا شرر

مذہب کی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا نظریہ سب سے پہلے برصغیر پاک و ہند کے مشہور مسلمان دانشور مولانا عبدالحلیم شرر نے پیش کیا۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:۔

"حالات کچھ ایسے ہیں کہ کوئی قوم دوسرے فرقے کے جذبات کو مجروح کئے بغیر مذہبی رسوم ادا نہیں کر سکتی، نہ ہی عوام میں اتنی رواداری اور صبر کا اتنا مادہ ہے کہ وہ دوسروں کی توہین کو معاف کر سکیں۔ اگر حالات اس حد تک پہنچ چکے ہیں تو پھر دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان دو صوبوں میں تقسیم کر دیا جائے اور آبادی کا تبادلہ کیا جائے۔ ہندوؤں کا رویہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنا ہمسایہ نہ بننے دیں اور وہ اپنے مندر کی گھنٹیاں "مسلم مشرکین" کو سنانا پسند کرتے ہیں، نہ وہ اذان سننے کے روادار ہیں۔ ان حالات میں "تقسیم ہند" کی تجویز مسلمانوں کے لئے بھی قابل قبول ہو گی کیونکہ وہ بھی ہندوؤں سے بیزار دکھائی دیتے ہیں"۔(1)

مولانا عبدالحلیم شرر کی اس تجویز میں قطعاً" کوئی ابہام نہیں، اس کے سرسری مطالعے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی اس تجویز کے ذریعے تاریخ میں پہلی بار مذہبی بنیادوں پر تقسیم ملک کا منصوبہ پیش کیا تھا یعنی "مسلم ہندوستان" اور "ہندو ہندوستان"۔ اپنے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لئے انہوں نے "تقسیم ہند" کی تجویز کے الفاظ استعمال کئے تھے۔ حیرت ناک بات تو یہ ہے کہ انہوں نے تبادلہ آبادی کی تجویز بھی پیش کی تھی۔ اس شخص کی سیاسی بصیرت کو خراج تحسین پیش کرنا پڑتا ہے۔ کتنا دوربین مدبر تھا جس نے اشارہ ہی نہیں کیا تھا بلکہ غیر مبہم لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ اگر مذہبی بنیادوں پر ملک کو تقسیم کیا گیا تو تبادلہ آبادی کا مرحلہ بھی پیش آئے گا۔ مگر اس کی اس پوری تجویز پر کسی نے کان نہ دھرا لیکن ٹھیک 57 سال کے بعد اسی اگست کے مہینے میں کہ جس مہینے میں اس نے تقسیم ملک کی تجویز پیش کی تھی ملک تقسیم ہو گیا اور اتنے بڑے پیمانے پر تبادلہ آبادی ہوا کہ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

کتنی بڑی بددیانتی ہے کہ جس مسلمان مدبر و مفکر نے سب سے پہلے تقسیم ملک کا حقیقت آفریں نظریہ پیش کیا اس کا نام تک نہیں لیا جاتا اور اس کے اس تصور کو ڈاکٹر اقبال کے کھاتے میں ڈال کر انہیں مصور پاکستان بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگست 1890ء میں جب مولانا شرر نے یہ تصور پیش کیا تھا اس وقت اقبال کی عمر قریباً چودہ سال تھی اور وہ حصول تعلیم کے مرحلے سے گزر رہے تھے۔ اس وقت انہیں کوئی جانتا تک نہ تھا اور نہ کسی کو یہ معلوم تھا کہ 14 سال کا یہ لڑکا آگے بڑھ کر کتنا بڑا شاعر اور مفکر بننے والا ہے بلکہ خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔ ادھر مولانا شرر ان دنوں شہرت و ناموری کی بلندیوں پر پرواز کر رہے تھے، ان کی تحریریں، ان کی تصانیف ملک کے طول و عرض میں پھیل رہی تھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ڈاکٹر اقبال کی نظر سے ان کا یہ منصوبہ نہ گزرا ہو۔ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اقبال نے روشنی مولانا شرر کے اس منصوبے سے حاصل کی تھی، انہی کی فکر سے اپنی فکر کا چراغ جلایا تھا اور مولانا شرر یقیناً ڈاکٹر اقبال کے پیش رو اور ان کے رہنما تھے۔

چوہدری رحمت علی کا نظریہ

مولانا عبدالحلیم شرر کے بعد دوسرا شخص جس نے تقسیم ملک کا نظریہ پیش کیا وہ ہوشیار پور (مشرقی پنجاب) کے چوہدری رحمت علی تھے۔ انہوں نے مولانا شرر کی اسکیم کے منظر عام پر آنے کے 25 سال بعد یعنی 1915ء میں "بزم شبلی" کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اسلامیہ کالج لاہور کے ایک اجتماع میں اپنا نظریہ پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ:۔

"ہندوستان کا شمالی منطقہ اسلامی علاقہ ہے، ہم اسے اسلامی ریاست میں تبدیل کریں گے لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس علاقے کے باشندے خود کو باقی ہندوستان سے منقطع کر لیں۔ اسلام اور خود ہمارے لئے بہتری اسی میں ہے کہ ہم یہ علیحدگی جلد سے جلد اختیار کر لیں"۔("پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن" بحوالہ "تاریخ نظریہ پاکستان ص 291 مطبوعہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام لاہور)

قطع نظراس سے کہ چوہدری صاحب نے بعد میں اپنی تجویز کو پھیلا دیا اور حیدرستان، معین ستان اور صدیق ستان وغیرہ کے نام سے متعدد آزاد اسلامی ریاستوں کا تصور پیش کیا جو نا قابل عمل تھا مگر ایک بات تو تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ اقبال کے خطبہ الہ آباد (1930ء) سے پورے پندرہ سال قبل انہوں نے ہندوستان کے شمالی علاقوں کو اسلامی ریاست کی حیثیت دینے کا مطالبہ کیا تھا۔

خیری برادران کا نظریہ

چوہدری رحمت علی کی تجویز کے منظر عام پر آنے کے 2 سال کے بعد اور مولانا شرر کی اسکیم کے منظر عام پر آنے کے 27 سال بعد خیری برادران (جبار خیری، ستار خیری) نے اپنا ایک فارمولا اسٹاک ہوم کی سوشلسٹ کانفرنس میں پیش کیا۔ یہ کانفرنس 1917ء میں منعقد ہوئی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب پہلی جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ خیری برادران نے اس کانفرنس میں اپنی تجویز کی نقول "مسلمانان ہند کی مرکزی کمیٹی" کی طرف سے تقسیم کی تھیں۔ اس فارمولے میں خیری برادران نے قومیتوں کے مسئلے کو حل کرنے کی غرض سے یہ تجویز پیش کی تھی کہ:-

"ہندوستان کو مسلم انڈیا اور ہندو انڈیا میں تقسیم کر دیا جائے"۔(2)

نادر علی وکیل کی تجویز

خیری برادران کی تجویز کے 3 سال کے بعد آگرہ کے نادر علی وکیل نے 1920ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس پمفلٹ میں ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کا حل بھی پیش کیا گیا تھا۔ حل یہ تھا کہ ہندوستان کو مذہبی بنیادوں پر "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" میں تقسیم کر دیا جائے۔(3) نادر علی صاحب نے اپنی تجویز میں اگرچہ مسلم اکثریت کے علاقوں کی نشاندہی تو نہیں کی تھی نہ اعداد و شمار پیش کئے تھے جن سے واضح ہوتا کہ وہ کون سے علاقے ہیں جنہیں نادر علی صاحب "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" میں شامل کرانا چاہتے ہیں لیکن ایک بات تو ثابت ہو گئی کہ ڈاکٹر اقبال کے تصور پاکستان سے دس سال قبل بھی یہ نظریہ موجود

تھا کہ ہندوستان کے سیاسی اور فرقہ وارانہ مسئلے کا حل ایک ہی ہے کہ ملک کو "ہندو ہندوستان" اور "مسلم ہندوستان" میں تقسیم کر دیا جائے۔

سردار گل محمد خاں کی تجویز

یہ 1922ء کا واقعہ ہے کہ صوبہ سرحد کے بعض علاقوں کو پنجاب میں ضم کر دینے کے مسئلے پر ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ یہ کمیشن "برنیشو کمیٹی" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے انجمن اسلامیہ ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار گل محمد خاں نے اپنی تجویز ان الفاظ میں پیش کی۔

"ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ انجمن اسلامیہ (ڈیرہ اسماعیل خاں) کے رکن کی حیثیت سے میرا نظریہ یہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب میں اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا سارا علاقہ مسلمانوں کو دے دینا چاہئے"۔(4)

ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو شمال اور جنوب میں تقسیم کر دینے کا نظریہ کہاں تک قابل عمل تھا۔ دیکھنے کی بات صرف یہ ہے کہ سردار گل محمد خاں نے ملک کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا اور اس نظریہ کی بنیاد خالص مذہبی تھی۔ آگرہ اور دہلی ہندوستان کے مسلمانوں کے دو بڑے تہذیبی مراکز تھے اور آگرہ کے بعد واقع علاقے خصوصاً" دہلی سے لے کر (جن میں یوپی کے مغربی علاقے بھی شامل تھے) پنجاب، کشمیر، سرحد، بلوچستان اور سندھ تک کے علاقے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے تھے، سردار گل محمد خان ان علاقوں کو ملا کر ایک اسلامی ریاست میں تبدیل کر دینا چاہتے تھے۔ اپنا یہ نظریہ انہوں نے 1922ء میں پیش کیا تھا یعنی اقبال کے خطبہ الہ آباد سے 8 سال قبل۔

مولانا محمد علی جوہر کی پیش گوئی

1916ء سے 1923ء تک کا زمانہ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے نہایت نازک

زمانہ تھا۔ اس سات سالہ دور میں ہندوؤں کی مختلف تنظیموں نے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت "تحفظ انسداد گئوکشی" "شدھی" اور "سنگٹھن" کے نام پر ملک کے طول و عرض میں ہزاروں مسلمانوں کا خون بہایا' ان کے مکانات اور دوکانیں نذر آتش کر دیں' بچوں اور عورتوں کے ساتھ نہایت بہیمانہ اور انسانیت سوز سلوک کیا اور بعض علاقوں سے انہیں نقل مکانی پر مجبور کیا۔ یہ ملک گیر فسادات اتنے ہولناک تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے مسلمان داعی مولانا محمد علی جوہر کو بھی کہنا پڑا کہ:۔

"اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوں ریزی اسی طرح جاری رہی تو ہندوستان "ہندو انڈیا" اور "مسلم انڈیا" میں تقسیم ہو جائے گا"۔(5)

مولانا نے یہ تقریر 1924ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے کی تھی۔ گویا مولانا محمد علی جوہر نے صرف تقسیم ملک کا تخیل ہی پیش نہیں کیا بلکہ برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی پیش گوئی بھی کر دی تھی اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کی یہ پیش گوئی 23 سال کے بعد حرف بحرف پوری ہوئی۔ یاد رہے کہ اقبال نے تقسیم ملک کی تجویز مولانا جوہر کی تجویز کے 6 سال کے بعد پیش کی۔

لالہ لاجپت رائے کی تجویز

مولانا محمد علی جوہر کی تجویز کے بعد مولانا حسرت موہانی' نواب سر ذوالفقار علی خاں' مرتضیٰ احمد خاں میکش حتیٰ کہ ہندوؤں کے مشہور لیڈر لالہ لاجپت رائے نے بھی مذہبی بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کی تجاویز پیش کیں اور یہ ساری تجاویز 1924ء اور 1929ء کے درمیان پیش کی گئیں۔ لالہ لاجپت رائے نے تو ہندوستان کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ ایک حصہ میں پورا پنجاب' سرحد' سندھ اور دوسرے حصے میں مشرقی بنگال' تیسرے حصے میں وہ علاقے جو کسی مسلم صوبہ میں شامل نہیں تھے مگر ان میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جیسے جموں و کشمیر اور مالابار۔ ان علاقوں کو مسلم انڈیا قرار دیا گیا تھا۔ چوتھا حصہ باقی ہندوستان پر مشتمل تھا اور یہ ہندو اکثریت کا علاقہ تھا

("یعنی ہندو انڈیا")(6)

یہ حقائق ہمارے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں کہ اقبال تصور پاکستان کے ہرگز خالق اول نہیں تھے ان سے بہت پہلے مذہبی بنیادوں پر ملک کی تقسیم کی بہت سی تجاویز منظر عام پر آ چکی تھیں اور یہ تجاویز یقیناً ان کے سامنے ہوں گی۔ انہیں سامنے رکھ کر انہوں نے اپنی وہ تجویز مرتب کی جو خطبہ الہ آباد کی صورت میں سامنے آئی۔

اقبال کی تجویز

1930ء میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کو آل انڈیا مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا۔ یقیناً یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو انہیں نصیب ہوا اور اپنی خدمات جلیلہ کے پیش نظر وہ اس کے پوری طرح مستحق تھے۔ اسی سال یعنی دسمبر 1930ء میں الہ آباد کے مقام پر آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت بھی ڈاکٹر صاحب نے فرمائی۔ اپنے خطبہ صدارت میں انہوں نے بھی مذہبی بنیاد پر ملک کی تقسیم کا تصور پیش کیا۔ ان کا یہ تصور ان کے پیش رو مفکرین کے مقابلے میں اس اعتبار سے منفرد تھا کہ انہوں نے اس کا مذہبی' سیاسی اور سماجی پس منظر بڑے موثر اور فلسفیانہ انداز سے پیش کیا تھا جو تاریخی حقائق پر مبنی تھا۔ اپنے نظریے کا پس منظر بیان کرنے کے بعد انہوں نے اپنی تجویز ان الفاظ میں پیش کی:۔

"میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے' خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی"۔(7)

بلاشبہ ڈاکٹر اقبال کی اس تجویز کو یہ انفرادیت حاصل ہے کہ انہوں نے اسے مسلمانوں کی ایک تنظیم کے پلیٹ فارم سے پیش کیا جبکہ دوسرے مسلمان مفکرین اور مدبرین نے اسے اپنی ذاتی رائے کے طور پر پیش کیا لیکن اس کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال کا تصور پاکستان ان کی اپنی تخلیق نہیں تھا بلکہ انہوں نے

اپنے پیش رو مفکرین سے مستعار لیا تھا۔ ان سے پہلے جن مسلمان دانشوروں نے مذہبی بنیادوں پر اپنے تصورات و نظریات پیش کئے تھے یہ ان کی ایک واضح صورت تھی بلکہ لالہ لاجپت رائے کا تصور اس اعتبار سے زیادہ وسیع اور جامع تھا کہ انہوں نے جموں و کشمیر اور بنگال کو بھی اسلامی ریاست کا درجہ دینے کی تجویز پیش کی تھی جبکہ اقبال کی تجویز میں صرف پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ریاست کا ذکر تھا اس میں جموں و کشمیر اور بنگال کو شامل نہیں کیا گیا تھا۔

تقسیم پنجاب و بنگال کا نقیب ___ سر اقبال

ایک اور بہت بڑی صداقت ہے جس کا اعتراف کرنے سے مسلسل گریز کیا گیا اور اب تک کیا جا رہا ہے وہ صداقت ہے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مسئلہ۔ اس کی ساری ذمہ داری کرپس مشن پر ڈال دی جاتی ہے اور باؤنڈری کمیشن کو مطعون کیا جاتا ہے مگر کوئی نہیں دیکھتا کہ اصل حقائق کیا ہیں اور بات کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ پنجاب کی تقسیم کا فارمولا تو خود ڈاکٹر اقبال نے پیش کیا۔ چنانچہ انہوں نے خطبہ الہ آباد میں نہایت واضح طور پر فرمایا کہ میری اس تجویز پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ:-

"اگر اس قسم کی کوئی ریاست قائم ہوئی تو اس کا رقبہ اس قدر وسیع ہو گا کہ (مسلمانوں کے لئے) اس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ بے شک اگر رقبہ کا لحاظ کیا جائے تو ____ یہ خیال صحیح ہے لیکن اگر آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہو گی۔ غالباً" قسمت انبالہ (انبالہ ڈویژن) یا اس قسم کے دوسرے اضلاع کو الگ کر دینے سے جن میں ہندو آبادی کا غلبہ ہے اس کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں اور بھی کمی ہو جائے گی"-(8)

آپ نے دیکھا کہ اقبال نے خدانخواستہ کسی بدنیتی سے نہیں بلکہ اپنی تجویز کو ہندو اور حکومت برطانیہ کے لئے قابل قبول بنانے کی غرض سے پنجاب کو تقسیم کر دینے کا فارمولا پیش کیا تھا اور نہ صرف انبالہ ڈویژن بلکہ پنجاب کے بعض اور اضلاع کو بھی

جن میں ہندوؤں کی اکثریت تھی پاکستان سے الگ کر کے بھارت میں شامل کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ کرپس مشن اور باؤنڈری کمیشن نے ڈاکٹر اقبال کے دکھائے ہوئے راستے ہی کو اختیار کیا اور پنجاب کی تقسیم کی بنیاد پر انہوں نے بنگال کو بھی تقسیم کر دیا۔

خلاصہ بحث:

یہ وہ حقائق ہیں جن کی تردید نہیں کی جا سکتی مگر افسوس کہ ہمارے ہاں تاریخ کو مسخ کرنے کا فریضہ بڑی مستعدی اور پوری "ذمہ داری" سے ادا کیا جاتا ہے۔ جھوٹ جی بھر کر اور مسلسل بولا جاتا ہے اور تاریخ کو اپنی خواہشات کے تابع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن حقائق آخر حقائق ہیں، ایک دن تو سامنے آ ہی جاتے ہیں۔

آپ نے دیکھ لیا کہ حقائق نے ثابت کر دیا کہ 1857ء کا ہنگامہ ہرگز اسلامی جہاد نہیں تھا اور مسلمانوں کے تمام مکاتب فکر کے جید علما نے اسے فتنہ و فساد اور خلاف اسلام اقدام قرار دیا اور انگریزوں کی حمایت کی۔ اس میں سر سید احمد خاں کا کردار ایک انتہائی دور بین، صاحب نظر اور قوم کے مخلص ترین بہی خواہ اور خیر اندیش رہنما کا کردار تھا۔ اقبال نے بھی سر سید احمد خاں کے نقش قدم پر چل کر انگریزوں کی خود بھی اطاعت و فرماں برداری کی اور قوم کو بھی سرکار کی اطاعت کا درس دیا۔ پاکستان کا تصور انہوں نے ضرور پیش کیا لیکن یہ تصور ان کا اپنا نہیں تھا بلکہ ان سے پہلے بہت سے مفکروں اور دانشوروں نے پیش کیا تھا۔ وہ اس کے خالق اول ہرگز نہیں تھے۔ گویا یہ تصور پہلے سے موجود تھا جسے انہوں نے اپنا کر اپنے فلسفیانہ رنگ میں پیش کر دیا۔ حقائق تو اور بھی ہیں فی الحال انہی پر اکتفا کی جاتی ہے یہ حقائق بھی ہضم ہو جائیں تو بڑی بات ہے۔

فقیر پیام شاہجہانپوری

حواشی:

1- ماہنامہ "مہذب" لکھنؤ 23 اگست 1890ء و ("صحافت پاکستان و ہند میں" صفحہ 271، مولفہ ڈاکٹر عبد السلام خورشید)

2- جس کانفرنس میں خیری برادران نے یہ تجویز پیش کی تھی اس کی روداد کانفرنس کے جنرل سیکرٹری مسٹر کیمبل بزمین نے مرتب کی تھی اور ایک خط میں اس کی تصدیق کی تھی کہ خیری برادران نے مذہبی بنیادوں پر تقسیم ہند کا فارمولا اپنے پمفلٹ میں پیش کیا تھا۔ ان کا اصل خط حکومت پاکستان کے شعبہ اطلاعات اسلام آباد کی پریس گیلری میں موجود ہے جس کی نقل مدت ہوئی اس وقت کے ڈپٹی پرنسپل انفریشن آفیسر جناب این ایچ ہاشمی نے راقم الحروف کو عنایت فرمائی تھی۔ (پیام)

3- "شاہراہ پاکستان" ص 800 مولفہ چوہدری خلیق الزماں (مرحوم)

4- رپورٹ برنیز کمیٹی ص 729 جلد اول بحوالہ "تھاٹس آف پاکستان" مولفہ ڈاکٹر امبیدکر۔

5- شاہراہ پاکستان ص 801-

6- تاریخ نظریہ پاکستان ص 280، شائع کردہ کتب خانہ انجمن حمایت اسلام، لاہور۔

7- خطبات اقبال صفحہ 25 تا صفحہ 38، ترجمہ غلام احمد پرویز اردو اکیڈمی کراچی۔

8- ایضاً